ایک علمی تحریک کا دینی، علمی، فکری، ادبی اور اصلاحی ترجمان

ماہنامہ

ندائے اعتدال علی گڑھ

جون ۲۰۲۴ء

30/=

علامہ ابوالحسن علی ندوی ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر فاؤنڈیشن، علی گڑھ

ہمیں مال کی طلب نے مقصد سے غافل کر دیا

محمد طارق بدایونی

أَلۡهَىٰكُمُ ٱلتَّكَاثُرُ۔ حَتَّىٰ زُرۡتُمُ ٱلۡمَقَابِرَ۔ (التکاثر :۲-۱)

(تم لوگوں کو زیادہ سے زیادہ اور ایک دوسرے سے بڑھ کر دنیا حاصل کرنے کی دُھن نے غفلت میں ڈال رکھا ہے، یہاں تک کہ (اسی فکر میں) تم لبِ گورتک پہنچ جاتے ہو۔)

انسان اور اس کی دنیوی زندگی فانی ہے۔ہمیشہ کی زندگی صرف آخرت میں میسر ہے۔وہ دنیا میں چند دنوں کے لیے بھیجا گیا،عبادتِ رب اور طاعاتِ احکامِ الٰہی اس کا مقصد ہے؛لیکن انسان دنیا کے ساز وسامان جمع کرنے میں مشغول ومصروف ہے،مال و دولت کے کاموں میں مدہوش ہے اور زیادہ سے زیادہ کی ہوس،اس کا یہ جنون اُسے آخرت سے غافل رکھتا ہے۔باوجود اس کے کہ دنیا ایک ظاہری فریب،دھوکے کا کھیل اور تماشا ہے،اس کا ظاہری حُسن پُرکشش ہے اور حقیقت اس کے برعکس۔

آج مادیت پرستی،مشینی زندگی اور ترقیاتی دوڑ نے انسان کو غفلت کی ایسی نیند میں سُلا دیا ہے کہ وہ استحضارِ الٰہی اور قربِ الٰہی سے اتنا دور نکل جاتا ہے کہ اسے خانگی و بیرونی اور اجتماعی وانفرادی زندگی کا قرآنی شعور نہیں رہتا،حقوق اللہ وحقوق العباد ادا نہیں کرتا۔مطلوبہ کردار اور شیخی بگھارنے میں کوئی فرق نہیں کر پاتا۔رسول اللہ کی ترتیب کردہ زندگی کے فوائد اور جاہلی و یورپین زندگی کے مفاسد میں تمیز نہیں کر پاتا،(بالخصوص تجارت ومعیشت کے نبوی اصول اور مغربی اصولوں کے درمیان)۔اس کا یہ جذبہ تفاخر ومباہات کہ تجارت،نوکری اور معاشی زندگی میں آگے بڑھنا ہے،سوسائٹی میں عزت حاصل کرنا ہے،لوگوں کی دھوکہ باز آنکھوں کے پیمانے پر کھرا اترنا اور سرِفہرست رہنا ہے،اُسے قبر تک اور اُخروی زندگی میں جہنم تک پہنچا دیتا ہے۔بظاہر انسان اگر اپنے دنیوی مقاصد میں کامیاب ہو جائے تو ذرا غور کیجیے کہ وہ کس مقام پر کھڑا ہے،اس کی اخلاقیات کا کیا عالم ہے،عبادت و روحانیت سے کتنا تعلق باقی ہے اور سب سے بڑھ کر توکل علی اللہ اور رزاقیت پر یقین کس درجہ کا ہے۔یہ اس طرح اللہ تعالیٰ نے من وعن انسانی نفسیات بیان کی ہے۔افسوس تو اس کا ہے کہ انسان یہ سب کچھ اپنے آرام،سکھ اور چین کے لیے کرتا ہے،لیکن زندگی وفا نہیں کرتی،جب وہ اس لائق ہوتا ہے کہ وہ دنیا میں کچھ فائدہ اٹھائے تو وقتِ اجل آجاتا ہے۔یوں وہ نہ دنیا کا پورے طور پر رہتا ہے اور نہ آخرت کا۔

اب ذرا غور کیجیے جو نعمتیں اللہ نے عطا کی ہیں:جیسے مال وزر،اولاد،قبیلہ،طاقت،وقار،انصار واعوان،عزیز واقارب،بیرونی تعلقات ومعاملات،صحت وتندرستی،امن و امان،ادراک وحواس،آواز،سماعت و بصر،ماکولات ومشروبات اور پھر ایمان،اسلام،قرآن،شریعت،نبی وغیرہ۔اگر یہ نعمتیں انسان کے پاس نہ ہوتیں،وہ بے زبان ہوتا،یا پھر جانوروں کی طرح زبان ہوتی لیکن نطق کی صلاحیت نہ دی جاتی تو کیا وہ شیخی بگھارتا؟یا پھر ذکر کردہ تمام چیزوں سے رب محروم رکھتا تو کیا....؟اس لیے ہمیں چاہیے کہ ہم ان تمام نعمتوں کی قدر و قیمت جانیں اور اس پر اللہ کا شکر ادا کریں،یاد رہے،دنیوی ضروریاتِ زندگی کی تکمیل بھی ضروری ہے؛لیکن قناعت و استغناء کے ساتھ،اس طرح کہ مقصدِ اصلی کے حصول میں مدد ملے۔ ورنہ ہم اللہ کے رسول کے اس فرمان کے مصداق ہوں گے کہ''اطاعتِ پروردگار سے تم نے دنیا کی جستجو میں پھنس کر بے رغبتی کر لی اور مرتے دم تک غفلت برتی''۔

دنیا میں نہ جانے کتنے لوگ ایسے آئے ہیں،جنھوں نے دنیا کو بہت کچھ دیا،صرف اس خاطر کہ دنیا کو جیتنا ہے اور اس سے بہت کچھ جمع کیا کہ دنیا کو کنٹرول کیا جائے،اسی حساب وکتاب میں زندگی بسر کی،لوگوں کا مال ہڑپ کیا،حقوق تلفی کی،قتل وغارت گری مچائی؛لیکن ایک روز وہ پائی پائی کو ترسے،کھانے کے لالے پڑے،بُری موت پائی اور قبر میں دفنا دیے گئے اور بعضوں کو تو قبر بھی نصیب نہ ہو سکی!اور آج بھی دنیا میں بعض شر پسندوں نجی مفادات کے لیے اسی کوشش میں لگے ہوئے ہیں،لیکن انھیں سکون میسر نہیں آتا،وہ نیک صالح اولاد کو ترستے ہیں اور صحت وتندرستی کے ہزار مسئلوں سے جوجھتے ہیں۔کیوں کہ یہ انسان کی بھول ہے،دنیوی زندگی تو مختصر سا واقعہ ہے،زندگی کا چھوٹا سا صفحہ ہے جو محض کچھ دنوں بعد پلٹا دیا جائے گا اور پھر ایک طویل زندگی کی شروعات ہوگی۔اس لیے انسان کے دل و دماغ میں اٹھتے،بیٹھتے،کھاتے،پیتے،سوتے جاگتے غرض یہ کہ ہر وقت اللہ کا تصور اور عقبیٰ کی یاد تازہ رہے،خود کو سنبھالے اور فنا ہونے سے قبل دائمی زندگی کے لیے تیار کرلے۔دنیا کی مدہوشی،غفلت اور لا پرواہی سے نکلے اور عمیق سنجیدگی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا مقام جانے اور کماحقہ اُسے ادا کرے۔

مال کی لالچ وامنگ کبھی ختم نہیں ہوتی اور نہ مال و دولت انسان کا پیٹ بھر سکتے ہیں۔حدیث پاک میں آتا ہے کہ''اگر ابنِ آدم کے پاس سونے کی ایک وادی ہو،تو چاہے گا کہ اس کے پاس دو وادیاں ہوں اور اس کے منہ کو مٹی کے سوا کوئی چیز نہیں بھر سکتی''۔ایک روایت سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ انسان میرا مال،میرا مال کی دُہائی دیتا رہتا ہے.... حالاں کہ وہ یہ سب چھوڑ چھاڑ کر چلا جائے گا۔مسند احمد میں ایک روایت ہے کہ''ابن آدم بوڑھا ہو جاتا ہے،لیکن دو چیزیں اس کے ساتھ باقی رہ جاتی ہیں۔ایک لالچ دوسری امنگ''۔

خلاصۂ کلام یہ کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نیک اعمال کے ترک کر دینے اور آخرت کی تیاری سے متعلق خبردار کر رہا ہے،اور ان لوگوں پر ملامت فرما رہا ہے جو کثرتِ مال اور اپنی تعداد پر غرور کرتے ہیں،حالاں کہ وہ ایک دن مر جائیں گے اور منوں مٹی کے نیچے دبا دیے جائیں گے۔

☆☆☆

ماہنامہ

ندائے اعتدال علی گڑھ

جون ۲۰۲۴ء | جلد نمبر ۱۵ | شمارہ نمبر ۱۲ | ذوالقعدہ۔ذوالحجہ ۱۴۴۵ھ

بانی: ڈاکٹر محمد غیاث صدیقی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

زیر سرپرستی

مولانا بلال عبدالحی حسنی ندوی

(ناظم ندوۃ العلماء، لکھنؤ)

زیر نگرانی

ڈاکٹر سعد ماحی

(سکریٹری علامہ ابوالحسن علی ندوی ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر فاؤنڈیشن)

مدیر

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

tariqnadwialig@yahoo.co.in, Mob.9897776652

مجلس ادارات

- مولانا محمد الیاس ندوی بھٹکلی
- پروفیسر مسعود خالد علیگ
- مولانا محمد قمر الزماں ندوی
- مولانا مجیب الرحمٰن عتیق ندوی
- ڈاکٹر جمشید احمد ندوی

معاون مدیر

حسن عمار

محمد طارق بدایونی

سرکولیشن انچارج

سعید احمد انصاری 9808850029

شرح خریداری

فی شمارہ: ——— 30:00 روپے

سالانہ: ——— 300:00 روپے

سالانہ اعزازی ممبرشپ: ——— 500:00 روپے

بیرونی ممالک: ——— 30$ ڈالر

لائف ممبرشپ (۲۰ سال): ——— 4000:00 روپے

Bank Acount Detail: Mr Saeed Ahmad Ansari
Acount No: 6561000100039197
IFSC code: PUNB0656100
Punjab National Bank, Medical Road, Aligarh-202002
Mob. 9808850029

خط و کتابت کا پتہ:

مدرسۃ العلوم الاسلامیہ، ہمدرد نگر 'ڈی' کوارسی بائی پاس، علی گڑھ

e-mail: nidaeaetidal@gmail.com

Editor: Dr. M. Tariq Ayubi Nadwi

سعید احمد ندوی نے آئیڈیل گرافکس انٹر پرائزیز، علی گڑھ سے چھپوا کر دفتر علامہ ابوالحسن علی ندوی ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر فاؤنڈیشن، ہمدرد نگر ڈی، علی گڑھ سے شائع کیا

Printed & Published by Saeed Ahmad Nadwi behalf of the office of Allama Abul Hasan Ali Nadwi Educational & Welfare Foundation Hamdard Nagar-D, Jamalpur, Aligarh at Ideal Graphics Enterprises, Patwari Nagla, Aligarh

visit us: www.nadwifoundationaligarh.org

فہرست مضامین

۱	قرآن کا پیغام	ہمیں مال کی طلب نے مقصد سے غافل کر دیا	محمد طارق بدایونی	
۲	اداریہ	آئندہ ملک کا منظر نامہ کیا ہو گا	مدیر	۳
۳	فکر و نظر	فکری پستی یا ملی زوال....	ڈاکٹر محمد طارق ایوبی	۵
۴	... ...	علامہ شبلی نعمانیؒ کے افکار اور اصلاحی اقدامات	ڈاکٹر ظفر الاسلام اصلاحی	۲۳
۵	قضیۂ فلسطین	فلسطین پر مسلمانوں کا دینی، تاریخی اور شرعی حق	محمد عبداللہ بن حافظ محمد شمیم	۳۰
۶	تاریخ کے جھروکوں سے	دارالمصنفین کی علمی خدمات-ایک تعارف	عمار احمد ندوی	۴۲
۷	تحقیق و تنقید	اہل کتاب اور مسئلۂ کفر و ایمان (ق:۲۶)	مولانا محمد غزالی ندویؒ	۴۶
۸	اسلامی تحریکات	طالبان اور حماس کو سلام!	ادہم الشرقاوی/ترجمہ محمد صادر ندوی	۵۵
۹	تعارف و تبصرہ		ڈاکٹر محمد طارق ایوبی	۵۸
۱۰	آخری صفحہ	نبی اکرم ﷺ کا ایک انٹرویو	م-ط-ب	۶۴
۱۱	گوشۂ ادب	شاعری کی حقیقت	علامہ شبلی نعمانیؒ	

نوٹ: مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔ عدالتی چارہ جوئی علی گڑھ کی ہی عدالت میں ہو سکتی ہے۔

اداریہ

آئندہ ملک کا منظر نامہ کیا ہوگا؟

جب رسالہ آپ کے ہاتھ میں ہوگا،اس وقت تک عام انتخابات کے نتائج آچکے ہوں گے اور تقریباً یہ طے ہو چکا ہوگا کہ ملک آئندہ کس رخ پر چلے گا، جو کچھ جمہوریت باقی رہ گئی ہے، وہ بھی محفوظ رہے گی یا نہیں؟ صحیح معنیٰ میں آمریت کا آغاز ہوگا یا نہیں؟آئین تبدیل کیا جائے گا یا محفوظ رہے گا؟ایک ملک ایک الیکشن کا فارمولہ نافذ ہوگا کہ نہیں؟ یہاں مفصل تجزیہ اور الیکشن کے متعلق تفصیلات درج کرنا ہمارا مقصد نہیں ہے، تاہم دو تین ضروری باتیں قبل از وقت ذمہ داران ملت تک پہنچانا ضروری سمجھتے ہیں،آئین کی تبدیلی کی بات کوئی انتخابی دعویٰ اور مدعا نہیں ہے، بلکہ ہم نے تو پہلی بار اس وقت سنا تھا، جب ۲۰۲۰ء میں سی اے اے (CAA) کے سلسلے کی دہلی میں ملی تنظیموں کی ایک میٹنگ منعقد ہوئی تھی، اس میں مشہور انگریزی اخبار میں کام کرنے والے سینئر صحافی ضیاءالسلام صاحب نے کہا تھا کہ آر ایس ایس نے ایک کمیٹی بنائی ہے جس کو ۲۰۲۲ء تک آئین کا نیا مسودہ پیش کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی ہے، اب راہل گاندھی نے جس شد و مد کے ساتھ اس ایشو کو اٹھایا ہے، اس سے تو یہی سمجھا جاسکتا ہے کہ گرچہ ہم اب بھی سنجیدہ نہ ہوں، مگر ضیاءالسلام صاحب کی بات سنجیدہ تھی۔

بہر حال ۴؍ جون کے بعد منظر نامہ یا تو یکسر ہمارے خلاف ہوگا، یا اس طرح کا ہوگا کہ ہمیں کوئی فائدہ بھلے نہ ہو، مگر ذہنی ٹارچر (Mental Torture) سے کچھ راحت ضرور ملے گی۔ مطلب صاف ہے کہ اگر بھاجپا کی حکومت بنتی ہے جس کا قوی امکان ہے (اور ۴۰۰ پار کا نعرہ بھی خدانخواستہ کامیاب ہوتا ہے جس کا بظاہر کوئی امکان نہیں) تو وہ سب کچھ ہوگا جو اب تک نہیں ہوا، اور جس کی طرف راہل گاندھی اور کیجریوال نے اپنی تقریروں میں اشارہ کیا اور بار بار کیا، یو سی سی (UCC) کا نفاذ بھی ہوگا، این آر ایس سی (NRSC) بھی ہوگی اور ایک ملک ایک انتخاب One Nation One Election کا فارمولہ بھی عمل میں لایا جائے گا، آئین مکمل طور پر تبدیل ہوگا یا نہیں، یہ تو وقت بتائے گا، مگر آئین کے رہتے ہوئے بھی آئینی کا چلن ہونا تو طے ہے، اب اس صورت میں ہمارا منصوبہ کیا ہوگا، حالات کا مقابلہ کیسے کرنا ہے، اپنے تشخص کی حفاظت کیسے کرنی ہے، یہ طے کرنا بہر حال ضروری ہوگا، یہ ملحوظ رہے کہ مستقبل میں اگر یہ منظر نامہ سامنے آیا (لا قدر اللہ) تو بڑی مخلصانہ جدوجہد اور قربانی کے بعد ہی اس کو تبدیل کیا جاسکے گا، روایتی طرزِ عمل اور بغیر قربانی کے کچھ نہ ہو سکے گا، ہاں ہماری تساہلی اور نرم روی و بے بسی ملت کے بڑے حصے اور نوجوان نسل کو ذہنی ارتداد اور شکست خوردگی کی نفسیات میں ضرور مبتلا کردے گی۔

دوسری تصویر یہ بن سکتی ہے کہ متحدہ محاذ جیت جائے اور حکومت سازی میں کامیاب ہو جائے، اس لیے کہ ہماری معلومات اور تجزیہ یہ کہتا ہے کہ اس وقت الیکشن عوام اور الیکشن کمیشن کے درمیان ہو رہا ہے، عوام متحدہ محاذ کے ساتھ ہے اور الیکشن کمیشن بھاجپا کے ساتھ، نتیجہ کیا ہوگا خدا جانے، اگر یہ منظر نامہ بنتا ہے تو ہماری ذمہ داری مزید اہم ہو جائے گی، کیوں کہ ہم ماضی میں بڑی غلطیاں کر چکے ہیں، موقع کا فائدہ نہ اٹھانا، صحیح وقت پر صحیح فیصلہ نہ لینا، وسیع تناظر اور ملی مفاد میں بڑے فیصلے نہ لینا،

چھوٹے چھوٹے ذاتی مفادات کے لیے ملی کاز کی بلی دے دینا، دوسروں کا دستِ نگر بنے رہنا، دوسروں کے لیے جینا، ملی وسائل کو دوسروں کے لیے استعمال کرنے اور مسلسل بے فائدہ جلسے جلوس کرتے رہنے جیسی بڑی غلطیاں ہم نے کی ہیں۔ اگر ملک کا منظر نامہ بدلے تو ہمیں خیال رکھنا ہوگا کہ ہمارے لوگ الگ الگ سیاسی گلیاروں کے چکر نہ لگائیں، انفرادی تعلقات و مفادات کی بنیاد پر ملی موقف طے نہ کریں، جلسوں اور مشاعروں پر قناعت نہ کریں، زمینی سطح پر سیاسی شعور پیدا کریں، اجتماعیت کے ساتھ ملی مفاد میں منصوبے بنائیں اور آئندہ کے لیے متحدہ محاذ میں شامل جماعتوں سے بات کریں، اس بار تو صورت حال یہ ہے کہ انھوں نے آپ سے رابطہ تک ضروری نہ سمجھا اور لوگوں نے کہا کہ اس بار ساری جماعتوں نے مسلمانوں سے دوری بنائی ہے، بلکہ ہماری تو سماجوادی کے ایک سابق ایم ایل اے سے بات ہوئی، ہم نے کہا کہ اس بار تو آپ کے قائد بھی "مسلم" نام لینے سے گھبرا رہے ہیں اور ٹکٹ بھی کم سے کم دے رہے ہیں، تو انھوں نے کہا کہ ہماری اقلیتی سیل کی میٹنگ میں طے کیا گیا اور کہا گیا کہ اس بار آپ بھاجپا کا مقابلہ کریں اور "مسلم" نام کم سے کم لیں۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ بی جے پی کی بڑی کامیابی ہے کہ اس نے ہمارے ووٹ کو بکھیر دیا، بے حیثیت کر دیا اور تمام پارٹیوں کو ہم سے دوری بنانے پر مجبور کر دیا اور اس میں وہ بڑی حد تک کامیاب ہوئی۔ چناں چہ ساری پارٹیاں جانتی تھیں کہ مسلمانوں سے ووٹ مانگا جائے یا نہیں، وہ تو ہم کو ہی ووٹ دیں گے، اور یہی سچائی ہے کہ ہمارے پاس اس کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں۔ البتہ اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ اگر اس طریقے سے متحدہ محاذ کامیاب ہوتا ہے اور ہم آئندہ پانچ سال جلسہ جلوس، دلی چلو، لکھنؤ چلو کے کلچر سے دور رہ کر دانشمندی کے ساتھ گزارتے ہیں، تو پھر آئندہ انتخابات میں متحدہ محاذ کے لیے ہماری حصہ داری طے کرنا اس کی مجبوری ہوگی، اس دوران ایک اچھی بات یہ ہوئی کہ سماجی انصاف اور حصہ داری کا ایک بالکل نیا اور طاقت ور بیانیہ اختیار کیا ہے، اس کا کہنا ہے کہ حصہ داری محرومی کی بنیاد پر ہونا چاہیے، اس ملک میں ۵۰٪ فیصد پچھڑا طبقہ ہے، ۱۵٪ فیصد دلت ہے، ۸٪ فیصد آدی واسی ہیں، ۱۵٪ فیصد اقلیتیں ہیں اور ۵٪ فیصد جنرل کاسٹ کا غریب طبقہ ہے، اس پوری آبادی کی اکثریت گورنمنٹ سیکٹر، پبلک سیکٹر، میڈیا اور کارپوریٹ میں نمائندگی سے محروم ہے، ہمیں ذاتی طور پر سیاسی تناظر اور وطنِ عزیز کے کثیر ثقافتی معاشرہ میں بجائے ہندو مسلم کے یہ بیانیہ پسند آیا، ہم سمجھتے ہیں کہ اگر یہ بیانیہ فروغ پائے اور بحث اسی تناسب پر ہو، ڈیٹا اسی کے اعتبار سے تیار کیا جائے، اور مطالبہ بھی اسی تناظر میں کیا جائے تو آئندہ اس ملک کی سیاست میں ایک بڑی تبدیلی کا امکان ہے۔

بہر حال نتائج جو بھی ہوں، ان ہی دو شکلوں میں سے کوئی ایک شکل بنے گی، جو بھی شکل بنے، اس کے اعتبار سے ہمیں اپنا مستقبل طے کرنا ہوگا، جذباتیت، مفاد پرستی، خوف، غلامانہ ذہنیت اور انفرادی و علاقائی مسائل کو ملی کاز اور ملی موقف بنانے جیسی ماضی کی غلطیوں سے بچتے ہوئے، اجتماعی منصوبہ بندی اور سوجھ بوجھ کے ساتھ یہ طے کرنا ہوگا کہ آئندہ ہمارے ووٹ کی حیثیت بحال ہوگی یا پھر یہی بے حیثیتی باقی رہے گی۔

(ڈاکٹر محمد طارق ایوبی)

☆☆☆

فکرونظر

فکری پستی یا علمی زوال
(نظریاتی اختلاف اور فکری کشمکش کے تناظر میں)

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی

گذشتہ دنوں پڑوسی ملک پاکستان میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا، جس نے دل ودماغ کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا، ہمیں یقین نہیں آیا کہ ہم اکیسویں صدی کے اس دور میں جی رہے ہیں، جہاں بے شمار مسائل نے امتِ مسلمہ کو گھیر رکھا ہے، عالمی منظر نامہ پر امت مسلمہ بحیثیت مجموعی اپنا منصب و وقار کھو چکی ہے، فکری غلامی میں مسلم ممالک ایک دوسرے سے آگے بڑھنے میں مقابلہ کر رہے ہیں، تعلیمی نظام پوری طرح مغربی افکار کے رنگ میں رنگ دیا گیا ہے۔ مرکزِ اسلام میں ''معتدل اسلام'' کی بازگشت سنائی دے رہی ہے، اسلام کے آخری قلعے حجازِ مقدس میں مغربی تہذیب کی بالادستی ہر سطح پر قائم کی جارہی ہے، عالمِ اسلام پر مغرب کا سیاسی تسلط مکمل ہو چکا ہے، عرب بہاریہ کی ناکامی اور مصر میں اخوانی حکومت کا خاتمہ گویا تکمیل کا اعلان تھا، ترکیہ کی حکومت کے خلاف پروپیگنڈہ اگر کامیاب ہو جائے اور کمالی فکر کی حامل جماعت بر سرِ اقتدار آجائے اور فلسطین سے حماس کا خاتمہ ہو جائے تو یہ مان لینے میں کوئی حرج نہیں ہوگا کہ عالمِ عربی میں مغرب کا سیاسی اور عسکری تسلط مکمل ہو چکا، ہم یہاں بحث کی طوالت سے بچنے کے لیے ایران وافغانستان کی فکری بنیادوں اور موجودہ صورت حال کو فی الحال چھوڑتے ہیں، خود پاکستان کی صورت حال یہ ہے کہ وہ ''نئی اسلامی تجربہ گاہ'' کے تصور کے ساتھ وجود میں آیا تھا، لیکن یہ کیسی جلی تاریخی حقیقت ہے کہ اسلام ہمیشہ وہاں اجنبی رہا، ایک طرف نامذہبیت اور تجدد پسندی نے اس ملک میں ہمیشہ اسلام کی راہ میں روڑا اٹکایا تو دوسری طرف مسلکی شدت پسندی، بلکہ مسلکی جبر نے قوم کو کبھی متحد نہ ہونے دیا، ایک ایسے وقت میں جب پاکستان بھی دیوالیہ ہونے کے کنارے پر کھڑا ہے، مغرب کا تسلط اس پر مکمل ہو چکا ہے، عالمِ اسلام کی سب سے بڑی امید عالم عربی مغرب کی فکری، سیاسی اور عسکری یلغار کی زد میں ہے، اس طرح کا واقعہ پیش آنا کسی بڑے تاریخی حادثہ سے کم نہیں، اسے ہم اپنی فکری پستی کہیں یا فکری قلاشی کا عنوان دیں، یا علمی وسیاسی زوال کا شاخسانہ قرار دیں؟۔

جس وقت پہلے سے زیادہ اس کی ضرورت تھی کہ حضرات علماء مسلکی اور نظریاتی اختلافات سے بالا ہو کر اسلام کو پوری قوت سے پیش کرتے، ایک نظریہ کے طور پر اس کی تفہیم کرتے، فکرِ اسلامی کو اپنی تحریر وتقریر کا موضوع بناتے، جدید علمِ کلام کے لیے ایک کھیپ تیار کرتے، جس وقت الحاد نئے نئے راستوں سے داخل ہونے لگا، فکری ارتداد متدین افراد تک کے ذہنوں میں حلول کر گیا، اس وقت ضرورت تھی کہ اسلام کے ظاہر وباطن کا مطالعہ کیا جاتا، اس کی تعلیمات کو عصری اسلوب میں پیش کیا جاتا، اسلامی نظریۂ حیات کے روشن پہلوؤں کو پیش کیا جاتا، جدید رجحانات سے واقفیت حاصل کی جاتی اور جدید ذہن کے شبہات کا ازالہ کیا جاتا، اب علمِ کلام صرف عقائد کے باب تک محصور نہیں رہا، بلکہ زندگی کے مختلف شعبوں تک اس کا دائرہ وسیع ہو گیا، عبادات،

معاملات اور اخلاق و معاشرت سب اس کے دائرے میں آگئے، جس وقت ضرورت تھی کہ زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق اسلام کی تعلیمات کو سائنسی اسلوب میں پیش کیا جاتا، ضرورت تھی کہ دلائل کی بنیاد پر مادیت کے تار و پود بکھیر دیے جاتے، مختلف شعبہائے حیات سے متعلق مادہ پرستانہ نظریات و دعوؤں کی نامعقولیت، ناموزونیت کو ثابت کر دیا جاتا اور اسلام کو تمام افکار و رجحانات و نظریات کے مقابل ایک نئے فلسفے یا نئے اسلوب یا نئے کلام کے رنگ میں پیش کر کے حجت تمام کر دی جاتی، مغربی افکار و اقدار کا گہرا مطالعہ کیا جاتا، ان کے کھوکھلے پن، دوہرے معیار اور مادیتِ محض کو واضح کرنے کے ساتھ مغربی تہذیب کی عسکریت پسندی، فکری یلغار، دوہرے معیار اور ذہنی کشمکش سے آگاہ کیا جاتا اور اس کے بالمقابل اسلام کی حقانیت، اس کی روشن تعلیمات، اس کے نظریۂ حیات اور اس کے لافانی دستورِ زندگی کے اعتدال کو پیش کر کے دنیا کو اس کا تجربہ کرنے کی دعوت دی جاتی، جس وقت یہ ضرورت پہلے سے کہیں زیادہ شدید ہو گئی، ایسے وقت میں یہ بحث کس قدر خطرناک اور فکری دیوالیہ پن کی دلیل ہے کہ ۶۱ برس قبل ''مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش'' کے موضوع پر لکھی گئی کسی صاحبِ فضل و کمال اور امام وسطیت عالمِ بے مثال کی کتاب پڑھی جائے یا نہ پڑھی جائے، اس کو طلبہ کے نصاب میں داخل کیا جائے یا نہ کیا جائے، اس کتاب نے فکری و تہذیبی کشمکش کا تجزیہ کیا تھا، ۶۱ سال پہلے اس مغربی طوفان سے آگاہ کیا تھا، اس کے تدارک اور سدِّ باب کے لیے حل پیش کیا تھا اور مشورے دیے تھے، ظاہر ہے کہ ان مشوروں کو تسلیم کیا گیا نہ ان پر عمل ہوا، جس کے نتیجے میں مغرب کا فکری، سیاسی اور عسکری و معاشی تسلط مکمل ہو گیا، اب ایسے وقت میں ضرورت تو اس کی تھی کہ ان ۶۱ برسوں کا تجزیہ کیا جاتا، کیا کھویا کیا پایا، اس کا احتساب ہوتا، اس صورت حال سے نکلنے پر غور و خوض کیا جاتا، نئی نسل کو جدید الحاد اور فکری ارتداد سے بچانے کی فکر کی جاتی، از سرِ نو مغربی افکار و اقدار کے تسلط اور اس کے بدترین نتائج پر گفتگو کی جاتی، کرنے کا یہ کام تو نہیں کیا گیا، البتہ ایک ایسی بحث ضرور چھڑی جس سے یہ معلوم ہو گیا کہ ہم فکری پستی کے کس مقام پر کھڑے ہیں، ہماری تمام تر کوششوں اور مذہبی اداروں اور تنظیموں کی جد و جہد کے باوجود ہمارے معاشرہ میں مغربی اقدار پاؤں پسارنے میں کیوں کامیاب ہوئیں؟ نئی نسل میں الحاد کی لہر کیوں چلی؟ ''جدید اسلامی تجربہ گاہ'' میں الحاد و مغربیت پنجے گاڑنے میں کیوں کامیاب ہوئی؟ اسلام کی جڑیں وہاں کیوں مضبوط نہ ہو سکیں؟ اس ملک کو سیاسی استحکام کیوں نہ حاصل ہو سکا؟ اور بیرونی قوتیں اب تک وہاں کیوں کامیاب ہوتی رہی ہیں؟۔

قارئین سوچ رہے ہوں گے کہ آخر اصل واقعہ کیا ہے جو قلم کا پارہ اس قدر چڑھا ہوا ہے؟ دراصل پاکستان کے وفاق المدارس العربیہ نے گذشتہ دنوں یہ فیصلہ کیا کہ مدارس کے نصاب میں مولانا علی میاں ندویؒ کی کتاب ''مسلم دنیا میں اسلامیت و مغربیت کی کشمکش'' شامل کی جائے۔ بہت سے لوگوں کی طرف سے اس فیصلے کا استقبال کیا گیا، لیکن جلد ہی دیوبندی حلقوں کی طرف سے اس کے خلاف احتجاج شروع ہو گیا اور بالآخر چند روز قبل مجلس عاملہ نے فیصلہ کیا کہ اس کتاب کو نصاب سے ہٹا دیا جائے، اس موقع پر جو طوفان برپا ہوا اور جس طرح کی سطحیت کا مظاہرہ کیا گیا، لاعلمی، کج فہمی اور فکرِ اسلامی سے ناواقفیت کی جو مثالیں پیش کی گئیں وہ ناقابل بیان ہیں، علم کے نام پر جہالت، ناخواندگی، ناواقفیت، تنگ نظری، تعصب، شدت پسندی، گروہ بندی، سطحی زبان اور سب سے بڑھ کر مذہبی سیاست جیسی تمام بیماریاں یک لخت منظر عام پر آگئیں، دراصل وفاق کی صدارت اس

مرتبہ مفتی تقی عثمانی مدظلہٗ کے حصے میں آئی، انھیں نئے علماء میں فکر وآگہی اور شعور پیدا کرنے کی فکر ہوئی، مفتی تقی عثمانی صاحب معتدل مزاج، وسیع الفکر اور جہاں دیدہ فقیہ وعالم ہیں، ان کی فقاہت کی دنیا معترف ہے، انھیں دنیا بھر میں گرچہ ترجمانِ دیوبند سمجھا جاتا ہے، لیکن ایک مخصوص حلقہ ان کی اس حیثیت کو قبول نہیں کرتا۔ مفتی صاحب ہمیشہ دیوبند کی برتری ومرجعیت اور اکابرِ دیوبند کے فضائل، بہت فراخ دلی کے ساتھ بیان کرتے ہیں اور بڑی حد تک اسی فکر کی نمائندگی بھی کرتے ہیں، لیکن بہر حال وہ طبقہ جو آزادی کے بعد دیوبندی مکتبِ فکر کا اصل ترجمان سمجھا گیا، ان کی یہ حیثیت تسلیم نہیں کرتا، اس لیے کہ ان کا فکری شجرہ حضرت تھانویؒ اور علامہ شبیر احمد عثمانیؒ سے استوار ہے، پھر ان کے یہاں فکری توسع اور فکرِ اسلامی سے بھی وابستگی مسلّم ہے، اس حقیقت کو کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا کہ آزادی اور تقسیم کے بعد برصغیر کے دیوبندی حلقے میں حضرت تھانوی اور حضرت عثمانی کے افکار کی جگہ مخصوص جمیعتی طرزِ فکر نے لے لی، یہی وجہ ہے کہ جب حضرت مفتی صاحب نے پاکستان میں اسلامی افکار اور مغربی باقیات کی کشمکش سے نمٹنے کے لیے، طلبہ کو فکرِ اسلامی سے واقف کرانے اور سوچ کے زاویے تبدیل کرنے اور فکری شعور پیدا کرنے کے لیے بیسویں صدی کے امام وسطیت واعتدال اور عظیم اسلامی مفکر کی ایک کتاب کو شاملِ نصاب کیا تو اس کے خلاف اس حد تک احتجاج کیا گیا کہ وفاق کو اپنے فیصلے سے پیچھے ہٹنا پڑا۔ حیرت اس پر ہے کہ جب امت کے ایک حلقے نے ایک ایسے مفکر کی اس کتاب کو قبول نہیں کیا، جس کا تعلق عقائد سے ہے نہ فقہ سے اور نہ کسی مسلک سے، جس مفکر کو آخری عہد میں توازن واعتدال کی علامت قرار دیا گیا۔ ڈاکٹر حسن الامرانی جو عالمِ عربی کے بڑے ادیب وناقد اور صاحبِ دل عالم ہیں، اپنے ایک مقالہ میں مولانا کو "حکیم الوسطیة" قرار دیا تھا۔ مولانا کی تقریروں اور تحریروں کی روشنی میں انھوں نے دلائل سے ثابت کیا ہے کہ مولانا ہر میدان میں اعتدال ووسطیت کو برتنے اور برقرار رکھنے میں کامیاب ہوئے ہیں، راہِ سلوک، عبادت، ادب وثقافت اور سیاست و دعوت ہر جگہ مولانا نے وسطیت کی نمائندگی کی ہے، حتیٰ کہ مغربی فکر وتہذیب کے سلسلے میں بھی مولانا نے معتدل موقف ہی اختیار کیا[1]، اس لیے کہ مولانا کا خمیر "خذ ما صفا ودع ما كدر" کے فلسفے سے اٹھا تھا اور وہ اسی کے داعی تھے، مولانا در حقیقت ایک داعی تھے اور ایک داعی کے سامنے ہمیشہ اصلاح اور اظہارِ دین کا فریضہ ہوتا ہے، شاید یہی وجہ ہے کہ ہمیں مولانا کے یہاں ایک نیا تنقیدی اسلوب دیکھنے کو ملتا ہے، مولانا کی یہ کتاب "مسلم ممالک میں اسلامیت ومغربیت کی کشمکش" ان کے اسا سلوب کی شاہکار ہے، اس کے علاوہ بھی مولانا کی تحریروں کا جائزہ لینے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مولانا کے تنقیدی اسلوب میں اظہارِ حق کے ساتھ شخصیات کے احترام میں کبھی بھی کمی نہیں آتی، تاریخی استناد، مضبوط استدلال، شائستگی اور تناسب وسنجیدگی ان کے اسلوب کی خصوصیت ہے، وہ احترام ومتانت کے ساتھ اختلاف کرتے ہیں اور اپنی بات بے لاگ لپیٹ کہتے ہیں۔

اب ظاہر ہے کہ یہ کوئی شرح عقائد یا روایتی علمِ کلام کی کتاب تو تھی نہیں، یہ جدید علمِ کلام اور فکرِ اسلامی کی ایک نمائندہ کتاب ہے، جس کو مولانا کی مشہور زمانہ کتاب "انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر" کا تکملہ وتتمہ یا امتداد کے طور پر دیکھا گیا، مولانا ایک مفکر تھے، فکرِ اسلامی کے شارح وترجمان تھے، کسی مخصوص حلقہ، فکر یا شخصیت کی طرف مولانا کی نسبت کرنا ان کی شخصیت اور کتب کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔ ایک اسلامی مفکر اپنے زمانے کا مطالعہ کرتا ہے، اپنے عہد کے تمام

رجحانات و نظریات سے گہری واقفیت حاصل کرتا ہے، پھر وہ ان کا نقد و احتساب کرتا ہے، اس کے سامنے خارجی حملے ہوتے ہیں، آنے والے طوفانوں کا وہ اندازہ کرتا ہے اور قبل از وقت ملت کو اس سے آگاہ کرنے کی ذمہ داری ادا کرتا ہے اور اس کے تدارک کی کوشش کرتا ہے، فقہ و فتاویٰ کی زبان نہیں استعمال کرتا، بلکہ دلائل کی روشنی میں چیلنجز کے مقابلہ کے لیے اسلامی حل پیش کرتا ہے، حضرت مفکر اسلام نے اس کتاب میں یہی کام کیا ہے، وہ صاحبِ فکر تھے، صاحبِ دل تھے، صاحبِ اسلوب تھے، انھوں نے جو کچھ محسوس کیا اُسے پوری امانت داری کے ساتھ صفحہ قرطاس پر منتقل کر دیا۔ عنفوانِ شباب میں وہ مولانا مودودیؒ کی ان تحریروں سے متاثر ہوئے جن تحریروں نے جدید تعلیم یافتہ طبقہ کا اسلام پر اعتماد بحال کیا تھا اور مغربی فکر و فلسفہ کی دھجیاں اڑا کر رکھ دی تھیں، مولانا نے یہاں تک اعتراف کیا ہے کہ "میں نے ان کی کتابوں اور تحریروں سے استفادہ کیا اور میری تحریروں میں اس کا رنگ آیا"[۲]، پھر مولانا کی ملاقات بانیٔ تبلیغ مولانا الیاس کاندھلویؒ سے ہوئی اور وہ رفتہ رفتہ ان کی فکر کے اسیر ہوئے، جماعتِ اسلامی سے انھیں ذہنی بُعد ہونے لگا، حتیٰ کہ وہ الگ ہو گئے اور مولانا مودودیؒ کی فکر میں "دین کی سیاسی تعبیر" پر علمی تنقید بھی کی، لیکن اس کے باوجود ان کے تعلق و ربط میں کوئی کمی نہیں آئی، اس تعلق و اعتدال کو مولانا کے اس مضمون میں خوب دیکھا جا سکتا ہے، جو انھوں نے مولانا مودودی پر لکھا، پرانے چراغ کی دوسری جلد میں وہ مضمون موجود ہے، اس میں مولانا نے اپنے اتفاق، فکری توارد، ربط و تعلق، حسنِ سلوک، حسنِ اختلاف اور نقد و نظر اور احترام و اعتراف کا جس خوب صورتی سے احاطہ کیا ہے وہ مولانا کا ہی حصہ ہے۔ مولانا کا یہ اقتباس پڑھیے اور ان کے توازن و اعتدال کی داد دیجیے:

> "میں نے جماعت سے اپنی بے اطمینانی اور اس کے اسباب کا اظہار کرنے میں ہمیشہ احتیاط سے کام لیا ہے اور جماعت کے موافقین یا مخالفین نے جب خط و کتابت کے ذریعہ سے میری علیحدگی کے اسباب اور مولانا یا جماعت کے بارے میں میری رائے دریافت کی تو میں نے اس کا ایسا جواب دینے سے ہمیشہ احتراز کیا، جس کو اشاعت میں لا کر غلط مقاصد حاصل کیے جا سکتے تھے، بے اطمینانی کے اسباب ریاضی و اقلیدس کے قواعد کی طرح چند بندھے ٹکے لفظوں اور ضابطوں کی شکل میں بیان نہیں کیے جا سکتے، اس کے اسباب مختلف النوع ہو سکتے ہیں، ان کا تعلق تعلیم و تربیت، ماحول کے اختلاف، وہ شخصیتیں جن سے آدمی متاثر ہوتا ہے، ان کی رنگا رنگی، ذاتی تجربات، موروثی و خاندانی اثرات، ذہنی ارتقا اور مطالعہ کے نتائج سے بھی ہو سکتا ہے اور ان سب کا الفاظ کی گرفت میں (خاص طور سے مختصر خطوط کی شکل میں) آنا مشکل ہوتا ہے، میں عام طور پر اس کے جواب میں لکھ دیتا تھا کہ اس کے سمجھنے کے لیے آپ میری کتاب "ارکانِ اربعہ"، "منصبِ نبوت اور اس کے عالی مقام حاملین"، "تاریخ دعوت و عزیمت" اور عربی "ربانیة لا رهبانية" کا مطالعہ کیجیے۔"[۳]

اس پیرا گراف سے پہلے مولانا نے نہایت وضاحت کے ساتھ اپنے تاثر و قدر دانی اور اس کے اسباب کا ذکر کیا ہے اور اس کے بعد پوری دیانت داری سے یہ بھی لکھ دیا ہے کہ:

''مولانا کو ایسا یگانۂ روزگار مفکر اسلام سمجھنے سے قاصر تھا، جس کی نظیر صدیوں میں نہیں ملتی، میں ان کا اصل امتیاز وجوہر ذہانت، ذہن کی صفائی ور سائی اور نئے انداز میں تحریر و تفہیم کی امتیازی قوت و قدرت سمجھتا تھا اور اب بھی سمجھتا ہوں۔''(۴)

مولانا کے انتقال پر حضرت مفکرِ اسلامؒ نے دار العلوم ندوۃ العلماء کی مسجد میں بہت مؤثر تعزیتی خطاب بھی کیا تھا، اور کیوں نہ کرتے جب کہ ان کی فکر کا خلاصہ یہ تھا جو اس مضمون کے آخری پیراگراف میں لکھا ہے:

''اب وہ اس دنیا میں نہیں ہیں، میں اظہارِ خیال، دینی صلاح و مشورہ اور فکر و فہم کے اس قدرتی تنوع کے حق کو محفوظ رکھتے ہوئے (جو ہر صاحبِ فکر بلکہ طالب علم کا حق ہے اور جس کا اظہار تاریخِ اسلام کے ہر دور میں ہوتا رہا ہے) بحیثیت مصنف، متکلم، مفکر اور داعی کے ان کی امتیازی وانفرادی خصوصیات اور بڑائی کا نہ صرف فراخ دلی بلکہ مسرت اور بہت سے مشترک روابط و خصوصیات کی بنا پر ایک گونہ فخر کے ساتھ اعتراف کرتا ہوں، اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان کو ان کی اسلامی خدمات کا پورا صلہ عطا فرمائے، ان کی لغزشوں سے جن سے نبی معصوم کے سوا کوئی فرد بشر خالی نہیں، در گزر فرمائے اور امت مسلمہ کی صحیح رہنمائی اور دست گیری فرمائے۔''(۵)

یہ درست ہے کہ مولانا نے فقہی نقطۂ نظر سے کبھی جمہور کا دامن نہیں چھوڑا، یہ بھی صحیح ہے کہ وہ ہمیشہ اکابرِ دیوبند کے دامن سے وابستہ رہے، یہ بھی صحیح ہے کہ سلوک و تربیت میں وہ ہمیشہ اس حلقہ کے علماء سے ہی وابستہ رہے، لیکن اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ اس حلقہ کا ایک طبقہ ہمیشہ مولانا کی ''محبت'' میں ان کا مخالف رہا اور مولانا کا وہ مقام کبھی تسلیم نہ کیا جو عالمِ اسلام نے انھیں عطا کیا۔ مولانا کی تحریروں میں خود ہی ان ''محبت کرنے والوں'' کا ذکر ملتا ہے، جنھیں محرم راز جانتے ہیں، یا سمجھنے والے بین السطور سے سمجھ لیتے ہیں۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ دیوبند سے ان کو وہی عقیدت تھی جو اس کے وابستگان کو ہونی چاہیے۔ یہی وجہ تھی کہ صد سالہ جشن میں مولانا نے اپنا دل نکال کر رکھ دیا تھا اور ایسا خطاب فرمایا تھا جسے صد سالہ کی کامیابی کی ضمانت قرار دیا گیا، اس حقیقت کا خود ہی مولانا نے اعتراف کیا ہے کہ مولانا محمد الیاسؒ کی باطنی کیفیات اور ان کی ایمان واحتساب کی دعوت سے وہ بے حد متاثر ہوئے اور اسی تاثر کے نتیجے میں وہ مولانا کی تحریک کے سر گرم سپاہی بن گئے، تبلیغ کے ہندوستان سے باہر بالخصوص عالمِ عربی میں تعارف کا ذریعہ بنے، لیکن یہ واقعہ ہے کہ ایک وقت وہ آیا جب وہ عملاً اس جماعت سے بھی علیحدہ ہو گئے، جس کا ذکر کاروانِ زندگی میں تفصیل سے موجود ہے(۶)، البتہ اس سے جو تعلقِ خاطر تھا وہ آخری سانس تک برقرار رہا، مفکر کے سامنے اپنے عہد کے مسائل اور تقاضے ہوتے ہیں، اس لیے جمود سے اس کو الجھن ہونا یقینی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا نے ان تمام تعلقات اور وابستگیوں کو نبھانے کے ساتھ آزادانہ کام کرنے کو ترجیح دی۔ چناں چہ ایک طرف پیامِ انسانیت کی تحریک برپا کی، دوسری طرف مسلم مجلس مشاورت کی سرپرستی فرمائی، تیسری طرف فکرِ اسلامی کے ارتقاء میں اپنا کردار نبھایا، ادبی پہلو سے بھی فکری رہنمائی کی۔ مختصر یہ کہ مولانا کی اس ہمہ جہتی اور جامعیت کو سمجھنے کے لیے مولانا رائے پوری اور مولانا احمد علی لاہوری کو

سمجھنا اور جاننا ضروری ہے۔ اوّل الذکر مولانا کے شیخ و مربی تھے تو ثانی الذکر سے مولانا نے قرآن کے اسباق پڑھے، مولانا کی فکری تشکیل میں ان دونوں شخصیات کے اثرات کا پایا جانا یقینی ہے۔

سوال یہ ہے کہ مولانا کی اس کتاب کی مخالفت کیوں کی گئی، کیا اس لیے کہ انھوں نے اس میں جماعتِ اسلامی، مولانا مودودیؒ، اور خمینی وغیرہ کی مثبت خصوصیات کا ذکر کیا ہے اور مہذب اسلوب اختیار کیا ہے؟ گرچہ میرے نزدیک یہ وجہ نہیں ہے، لیکن اگر مان لی جائے جیسا کہ کہا بھی گیا تو اس تذکرہ میں غلط کیا ہے؟ مفکر اپنے عہد کے علمی اسلوب میں گفتگو کرتا ہے، مولانا تو صاحبِ اسلوب تھے، مہذب زبان، شائستہ اسلوب، تلی بندھی تعبیرات کا استعمال مولانا کا امتیاز ہے، پھر مفکر کا کام ذاتیات پر گفتگو کرنا ہوتا ہے نہ کسی کی تحقیر و تذلیل مقصد، وہ تو دلائل کی روشنی میں بات کرتا ہے، فتنۂ قادیانیت پر بے شمار کتابیں لکھی گئیں، لیکن جن چند کتابوں کو اہلِ علم کی نگاہ میں وزن حاصل ہوا، ان میں مولانا کی کتاب "قادیانیت- تحلیل و تجزیہ" بھی ہے، اس میں مولانا نے خالص علمی اسلوب اختیار کیا ہے اور ہر جگہ "مرزا صاحب" سے خطاب کیا ہے، چناں چہ اس کتاب میں بھی مولانا نے دلائل کی بنیاد پر مثبت خصوصیات کا پوری امانت داری سے تذکرہ کیا ہے اور ساتھ ہی کلامی و نظریاتی اختلاف کا بھی ذکر کر دیا ہے۔ چناں چہ یہ عذر فضول ہے کہ اس میں جماعتِ اسلامی اور خمینی کا مثبت ذکر ہے، اس لیے کہ مولانا محترم نے مثبت تذکرے کے ساتھ یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ "ہندوستان و پاکستان کے ایک بڑے دینی حلقہ کو بعض فقہی و کلامی مسائل میں مولانا کی تحقیق، تعبیر یا طرزِ تحریر سے اختلاف ہونے کی بنا پر......"[۷]۔ اسی طرح ایران کا ذکر کرتے ہوئے اگر اُسے "اسلامی مشرق کا یونان" کہا ہے تو معاً بعد "وہاں بعض غالی مذہبی خیالات" کو اس کی پچھلی تاریخ کا نتیجہ قرار دیا ہے، خمینی کے سیاسی آراء اور اسلامی نظام کے نفاذ کی کوششوں کا تجزیہ کیا ہے تو خود اپنے تحفظات اور سنی اقلیت کا خیال نہ رکھنے کا بھی ذکر کیا ہے، پھر سوال یہ ہے کہ فکرِ اسلامی یا اسلام و مغرب کی عہدِ جدید میں کشمکش پر اگر گفتگو کی جائے گی تو شاہِ ایران، خمینی، اتاترک اور پھر حسن البنا، سید قطب اور مولانا مودودی اور جماعتِ اسلامی اور جماعت اخوان وغیرہ کا ذکر کیے بغیر گفتگو کو کیسے مکمل کیا جا سکے گا؟ پھر اگر وجہ یہ ہے کہ مولانا کے مثبت تذکرہ سے طلبہ کے عقائد خراب ہو جائیں گے تو یہ ایک عجیب سی بات ہے، وہ طلبہ جو عقائد کی کتابیں پڑھتے ہیں، تفسیر و حدیث کے جام پیتے ہیں، وہ محض صفحہ دو صفحہ کسی کے بارے میں پڑھ کر بہک جائیں گے، یہ بڑی ہلکی بات ہے، اس سے کئی اور سوال جنم لیتے ہیں، جنھیں میں یہاں چھوڑتا ہوں، میرے نزدیک اس اختلاف و احتجاج کی اصل وجہ کیا ہے، اس کا میں آخر میں تذکرہ کروں گا۔ سرِ دست یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ کتاب کیوں وجود میں آئی اور اس میں کیا ہے؟ اس لیے کہ اب کوئی پڑھتا ہے؟ نہ پڑھنے کا رواج ہے، بس سنی سنائی باتوں اور واٹساپ یونیورسٹی پر سارا دار و مدار رہتا ہے۔ فکرِ اسلامی کا موضوع مدارسِ اسلامیہ میں بالکل اجنبی بن کر رہ گیا ہے، جدید علمِ کلام اور اس کے تقاضوں سے کوئی تعلق ہی نہ رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علماء اپنے عہد کے حالات و رجحانات اور علمی و مذہبی اختلافات کے پیچھے کارفرما سیاسی کارفرمائیوں سے بڑی حد تک ناواقف رہتے ہیں، بس جو سن لیتے ہیں اسی کو نقل کرتے رہتے ہیں، علم و تحقیق کا کچھ لحاظ ہوتا ہے نہ خدا کے اس فرمان کا استحضار ما یلفظ من قول الا لدیہ رقیب عتید[۸]، (بندہ زبان سے جو لفظ نکالتا ہے، اُسے ریکارڈ کرنے کے لیے ایک محافظ فرشتہ موجود رہتا

ہے)اور نہ ہی اِس ارشادِ نبویؐ کا خوف ستاتا ہے کفی بالمرء کذباً أن یحدث بکل ما سمع [9]۔(آدمی کے جھوٹا ہونے کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ ہر سنی ہوئی بات(بدونِ تحقیق)بس یوں ہی بیان کردے)۔

مولانا کی یہ کتاب ۱۹۶۳ء میں وجود میں آئی، مولانا نے ۱۹۵۰ء میں اپنے بڑے بھائی کو حجاز سے خط لکھا تھا، اس میں صاف لکھا تھا کہ ''عالمِ اسلام کا قبلہ مکہ معظمہ اور بیت اللہ ہے اور مرکزِ اسلام کا قبلہ اسرِ دست مریکہ ہے''[10]، جس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مولانا صرف اسفار نہیں کرتے تھے، بلکہ ملکوں اور قوموں کا جائزہ لیتے تھے، چناں چہ عرصہ سے مولانا عالمِ اسلام کا جائزہ لے رہے تھے اور دیکھ رہے تھے کہ عالمِ اسلام میں بڑی تیزی کے ساتھ یہ رجحان پروان چڑھ رہا ہے کہ کامیاب زندگی اور ترقی کا واحد حل مغربی تہذیب کی کامل پیروی ہے، پھر مولانا نے اس موضوع پر قلم اٹھایا اور حرفِ آغاز میں صراحت سے لکھا:

> ''اس وقت تقریباً تمام مسلمان ممالک میں ایک ذہنی کشمکش اور شاید زیادہ صحیح الفاظ میں ایک ذہنی معرکہ برپا ہے، جس کو ہم اسلامی افکار و اقدار اور مغربی افکار و اقدار کی کشمکش یا معرکہ سے تعبیر کر سکتے ہیں، ان ملکوں کی قدیم تاریخ، مسلم اقوام کی اسلام سے گہری وابستگی اور محبت اور جس نام پر جنگِ آزادی لڑی اور جیتی گئی یا جس طاقت کے سہارے ان ملکوں کی آزادی کی حفاظت کی گئی، سب کا دعویٰ ہے کہ اس سرزمین پر صرف اسلامی افکار و اقدار کا حق ہے اور یہاں صرف اسی مسلکِ زندگی کی پیروی جائز ہے، جس کی اسلام نے دعوت دی ہے۔ لیکن اس کے برعکس جس طبقہ کے ہاتھ میں اس وقت ان ممالک کی زمام کار ہے، اس کی ذہنی ساخت، اس کی تعلیم و تربیت اور اس کی ذاتی و سیاسی مصالح کا تقاضا ہے کہ ان ممالک میں مغربی افکار و اقدار کو فروغ دیا جائے اور ان ممالک کو مغربی ممالک کے نقشِ قدم پر چلایا جائے اور جو دینی تصورات، قومی عادات، ضوابطِ حیات اور قوانین و روایات اس مقصد میں مزاحم ہوں، ان میں ترمیم و تنسیخ کی جائے اور بالاختصار یہ کہ ملک و معاشرہ کو تدریجی طور پر (لیکن عزم و فیصلہ کے ساتھ)''مغربیت'' کے سانچے میں ڈھال لیا جائے۔''[11]

مولانا مرحوم نے اسی فکری کشمکش کو مسلم ممالک کا سب سے بڑا مسئلہ قرار دیا، لیکن افسوس کہ اس بات پر توجہ نہ دی گئی، آج امتِ مسلمہ جس دوراہے پر کھڑی ہے، مسلم ممالک میں، اسلام، اسلامی تعلیمات، اسلامی نظام، اسلامی معاشرت، اسلامی تعلیمات میں زندگی کی صلاحیت پر اعتماد اور تجدد پسندی کی جو کشمکش اور صورت حال ہے وہ اسی کا نتیجہ ہے کہ بروقت مسئلہ پر توجہ نہیں دی گئی۔ مولانا نے لکھا تھا:

> ''میرے نزدیک یہی اس وقت مسلم ممالک کا سب سے بڑا حقیقی مسئلہ ہے، یہ مسئلہ نہ فرضی ہے نہ خیالی، مسلم ممالک کی اندرونی کمزوریوں اور مغربی تہذیب کے نفوذ و استیلاء کی کیفیت نے (جس کی نظیر تہذیبِ انسانی کی تاریخ میں مشکل سے ملے گی) ممالک کے مادی و سیاسی اقتدار نے سارے مسلم ممالک کے سامنے اس مسئلہ کو نہایت روشن سوالیہ نشان بنا کر کھڑا کر دیا ہے، جس کا جواب سب کو

دینا ہے اور اس سگنل کے بغیر کسی ملک کی گاڑی آگے نہیں بڑھ سکتی، مغربی تہذیب کے بارے میں یہ ممالک کیا رویّہ اختیار کرتے ہیں اور اپنے معاشرے کو موجودہ زندگی سے ہم آہنگ بنانے اور زمانہ کے قاہر تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے کون سی راہ اختیار کرتے ہیں اور اس میں کس حد تک ذہانت و جرأت کا ثبوت دیتے ہیں؟ اسی سوال کے جواب پر اس بات کا انحصار ہے کہ دنیا کے نقشہ میں ان قوموں کی نوعیت کیا قرار پاتی ہے، ان ملکوں میں اسلام کا کیا مستقبل ہے، اور وہ اس زمانے میں اسلام کے عالمگیر و ابدی پیغام کے لیے کہاں تک مفید ہو سکتے ہیں؟''(۱۲)

اس کتاب میں مولانا محترم نے جہاں خیزی و جہاں آرائی اور دنیا کے بدلتے نظام میں اپنی پوزیشن مستحکم کرنے اور دنیا کی تعمیرِ نو میں حصہ لینے کی رہنمائی کی ہے، حقائق و واقعات کا تجزیہ کرتے ہوئے بتایا ہے کہ اب کن چیزوں کا لحاظ رکھنا ہو گا، کن پہلوؤں کو برتنا ہو گا اور کن امور سے بچنا ہو گا۔ مولانا نے اس میں اپنے عہد کی اسلامی دنیا اور مختلف مسلم ممالک کی صورت حال کا جائزہ بھی لیا ہے، محاسبہ بھی کیا ہے اور مشورے بھی دیے ہیں، کتاب کے پہلے باب میں بعض ممالک کے مغربی تہذیب کے تئیں منفی رویّہ پر گفتگو کی ہے اور ابتدائی سطروں میں ہی یہ واضح کر دیا ہے کہ اس موقف کو درست نہیں قرار دیا جا سکتا۔ مولانا نے لکھا ہے:

''اس نئی اور پیچیدہ صورت حال سے نپٹنے کے لیے قدرتی طور پر تین موقف (رویّے) ہو سکتے ہیں، پہلا موقف یا رویّہ منفی اور سلبی (Negative) ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ عالمِ اسلام اس تہذیب کے سارے نتائج اور فوائد کا یکسر انکار کر دے اور اس کی کوئی اچھی بری بات سننے کا روادار نہ ہو، یا غیر جانب داری اختیار کر کے کنارہ کش ہو جائے، نہ اس سے کسی قسم کا فائدہ اٹھائے، نہ ان علوم کو ہاتھ لگانے پر تیار ہو، جن میں اہلِ مغرب کو تفوق و امتیاز حاصل ہے، طبعیات، ریاضیات اور ٹکنالوجی جیسے علوم میں بھی وہ مغرب سے استفادۂ علمی کو حرام اور اپنے لیے ''شجرۂ ممنوعہ'' سمجھے اور جدید آلات و مشینیں، ساز و سامان اور ضروریاتِ زندگی کے قبول کرنے سے بھی گریز کرے۔ اس موقف کا قدرتی نتیجہ عالمِ اسلام کی پسماندگی اور زندگی کے رواں دواں قافلہ سے بچھڑنے کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا، اس سے عالمِ اسلام کا رشتہ باقی دنیا سے منقطع ہو جائے گا اور وہ ایک محدود و حقیر جزیرہ بن کر رہ جائے گا، جس کا گرد و پیش کی دنیا سے کوئی پیوند نہیں ہو گا، سمندر میں ایسے بے شمار جزیرے ہو سکتے ہیں، لیکن خشکی میں اس طرح کے جزیروں کی گنجائش نہیں اور فطرتِ انسانی سے (جو اپنے ماحول سے کم و بیش متاثر و مستفید ہوتی ہے) جنگ کبھی کامیاب نہیں ہوتی۔''(۱۳)

اس موقف کی طبعی اور شرعی حیثیت سے بحث کرتے ہوئے اور عالمِ اسلام میں بغاوتوں کے اسباب کا تجزیہ کرتے ہوئے آخر میں اس صورت حال کا علاج پیش کیا ہے، جو مصنف کی حکیمانہ بصیرت، عمیق مطالعہ اور صحیح الفکری کی دلیل ہے۔

مصنف نے لکھا ہے:

"اس صورت حال کو کوئی فوجی طاقت، کوئی تعزیر اور سزا اور کوئی احتساب و نگرانی روک نہیں سکتی اور نہ اخباری اور ریڈیائی پروپیگنڈا، مال و دولت کے ذریعہ قلب و ضمیر کی خریداری، سفارتوں کی پُر تکلف اور شان دار تقریبات، اہلِ دین کو خوش کرنے کے لیے کچھ منصوبے، بین الاقوامی کانفرنسیں اور سیمینار جن سے ان ملکوں کی اسلام سے دلچسپی کا وقتاً فوقتاً اعلان کیا جاتا رہتا ہے، محدود ادارے اور دینی مظاہر اس انقلاب اور بغاوت کا راستہ روک سکتے ہیں۔ اس کا واحد راستہ یہ ہے کہ حقائق اور واقعات کا جرأت و دور اندیشی اور صحیح دینی روح اور دینی بصیرت کے ساتھ سامنا کیا جائے اور ملک میں دین کی صحیح تعلیم کے مطابق ہمہ گیر، صالح اور ضروری تبدیلی کے لیے صدقِ دل اور اخلاص کے ساتھ کوشش شروع کی جائے جن چیزوں کا ازالہ و سدِّ باب ضروری ہو ان کا سدِّ باب کیا جائے، جن اصلاحات کا نفاذ اور جن اسکیموں کا آغاز ضروری ہو ان کے آغاز میں دیر نہ کی جائے۔ اسلام، قرآن اور سنتِ رسول اللہ ﷺ کی روشنی میں اور اسلامی حدود کے مطابق معاشرہ میں مساوات اور انصاف قائم کیا جائے، اہلِ ملک کی خوش حالی اور فارغ البالی کے لیے ضروری قدم اٹھائے جائیں۔....... اس انتشار اور بغاوت سے بچنے کے لیے عوام میں دینی روح، طاقت ور ایمان، اخلاقی حِس اور اسلامی شعور پیدا کرنا ہوگا، اس ذہنی انتشار اور بے دلی اور بغاوت کے جراثیم کا خاتمہ کرنے کے لیے ان کے اسباب و محرکات کا مکمل ازالہ، حالات کی عمومی اصلاح اور سیرت و کردار میں تبدیلی کی ضرورت ہے، مغرب سے وہ لینا ہوگا جو اسلامی ممالک اور معاشرہ کے لیے مفید اور اس کے عقیدہ سے ہم آہنگ ہے اور بجائے خود کوئی عملی اور ایجابی افادیت رکھتا ہے اور قوم و ملک کو مضبوط کر سکتا ہے اور زندگی کی جدوجہد، سرفروشی اور دعوت الی اللہ کے مقصد میں مفید ہو سکتا ہے۔ اسلامی مشرق میں قیامِ امن کے لیے اور مسلمان اقوام کو اپنے عقیدہ و اسلامی زندگی پر قائم رکھنے کے لیے آج کوئی اور دوسرا راستہ نہیں ہے، زیادہ ٹھوس علمی تعبیر میں "عالمِ اسلام کو دراصل ایک ایسی ترقی پذیر عادلانہ اسلامی سوسائٹی کی تشکیل کی ضرورت ہے، جس میں اسلامی طریقۂ زندگی کو اپنے عملی و ثقافتی اظہار اور نمود کا پورا موقع مل سکے۔" (۱۴)

اس کے بعد اگلے باب میں مصنف نے مغربی تہذیب کے سلسلے میں عالمِ اسلام کے دوسرے موقف کا جائزہ لیا ہے، عالمِ اسلام میں تجدد و مغربیت کی تحریک کا ناقدانہ تذکرہ کیا ہے، مغربی تہذیب کے حامیوں، خود شکستگی اور خود سپردگی کے داعیوں اور اس کے ناقدوں پر منصفانہ تجزیہ لکھا ہے اور تفصیل سے عالمِ اسلام کا جائزہ و محاسبہ پیش کیا ہے، ابتدائی سطروں میں اس دوسرے موقف کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"دوسرا موقف شکست خوردگی، مکمل سپردگی اور ایک عقیدت مند اور سرگرم مقلد اور

ایک ایسے ہونہار و سعادت مند شاگرد کا ہے، جو ابھی سنّ بلوغ کو نہیں پہنچا، اور وہ یہ ہے کہ عالمِ اسلام کا کوئی حصہ اس مادّی، مشینی اور اپنا مخصوص مزاج و ذہن رکھنے والی تہذیب کو جوں کا توں قبول کرلے اور اس کے سارے بنیادی عقائد فکری رجحانات، مادی افکار و خیالات اور سیاسی و اقتصادی نظام پر ایمان لے آئے (جو عالمِ اسلام کے ماحول سے بہت دور نہایت مختلف حالات میں پیدا ہوئے اور ان ہی حالات میں ان کی تشکیل اور پرورش ہوئی) پھر اپنے ملک میں اس کی مکمل نقل کرنا چاہے اور اس کے لیے ہر قسم کی قربانی اور اس کے لیے بڑی سے بڑی قیمت ادا کرنے پر آمادہ ہو۔"(۱۵)

اس باب میں مولانا نے تفصیل سے مغرب کے حامیوں اور ناقدوں کا تجزیہ و احتساب کیا ہے، ترکی ہندوستان پاکستان، ایران عراق، تیونس، شام، لیبیا و مراکش وغیرہ کا جائزہ لیا ہے، عالمِ اسلام میں مصر کے کردار کی اہمیت تسلیم کرتے ہوئے علیحدہ عنوان کے تحت تفصیلی گفتگو کی ہے۔ مولانا نے اسی ضمن میں اس طوفان سے مقابلہ کرنے کے لیے مطلوب وصف سے داعی و تحریک کے متعلق لکھا ہے:

"مغربی تہذیب کا آنکھ سے آنکھ ملا کر مقابلہ، اس پر جرأت مندانہ اور پُر از اعتماد تنقید اور ایک داعی اور حملہ آور کی حیثیت سے اس کا سامنا کرنے کے لیے ایک مربوط اور ٹھوس کوشش، مغربی تہذیب کے مزاج اور اس کی ترکیب سے گہری واقفیت، اسلام کی دعوت اور اس کی تعلیمات اور اس کے مسلکِ زندگی پر مضبوط عقیدہ اور داعیانہ جوش کی ضرورت تھی۔ اس کے لیے اس سیاسی رہنما کے موقف کے بجائے (جس کو سید جمال الدین افغانی نے اختیار کیا تھا) اور اس دفاعی پوزیشن کے بجائے جس میں شیخ محمد عبدہ نظر آتے ہیں، ایک دوسرے موقف کی ضرورت تھی۔ مصر میں الاخوان المسلون کی تحریک اگر اپنی صحیح اور طبعی رفتار سے آگے بڑھتی رہتی اور اس کے جھنڈے کے نیچے عالمِ اسلام کے مفکرین، ممتاز اہلِ قلم اور ماہرینِ فن جمع ہو جاتے، تو اس تحریک سے بڑی امید تھی کہ وہ مشرقِ وسطیٰ میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے کام کی تکمیل کر سکے گی۔"(۱۶)

آگے تیسرا اور فیصلہ کن موقف واضح کرنے سے پہلے مولانا نے ایک عنوان قائم کیا ہے "مغربیت کے عالمگیر رجحان کے اسباب اور ان کا علاج"، یہ اس کتاب کی روح اور بڑا قیمتی باب ہے، اس میں مولانا کی مفکرانہ شان نمایاں ہو کر نظر آتی ہے، حالات کا صحیح اندازہ، مغرب زدگی، بلکہ مغربی رنگ میں رنگ جانے کے اسباب کی درست تشخیص اور پھر اس کے صحیح علاج کی رہنمائی فراہم کی گئی ہے، مصنف نے مبصرانہ تجزیہ کرتے ہوئے مغربی نظام تعلیم کو مشرق پر مغربی تہذیب کے تسلط کا بنیادی اور کلیدی سبب قرار دیا ہے اور پھر زہر کا تریاق بتاتے ہوئے لکھا ہے:

"اس کا علاج (خواہ وہ کتنا ہی دیر طلب ہو) اس کے سوا کچھ نہیں کہ اس نظام تعلیم کو از سرِ نو ڈھالا جائے، اس کو مسلمان اقوام کے عقائد و مسلمات اور مقاصد اور ضروریات کے مطابق بنایا جائے،

اس کے تمام علوم و مضامین سے مادہ پرستی، خدا بیزاری، اخلاقی و روحانی اقدار سے بغاوت اور جسم پرستی کی روح نکال کر اس میں خدا پرستی، خدا طلبی، آخرت کوشی، تقویٰ شعاری اور انسانیت کی روح پیدا کی جائے، زبان و ادب سے لے کر فلسفہ و نفسیات تک، اور علوم عمرانیہ سے لے کر معاشیات و سیاسیات تک سب کو ایک نئے سانچہ میں ڈھالا جائے، مغرب کے ذہنی تسلط کو دور کیا جائے، اس کی معصومیت و امامت کا انکار کیا جائے، اس کے علوم و نظریات کو آزادانہ تنقید اور جرأت مندانہ تشریح (پوسٹ مارٹم) کا موضوع قرار دیا جائے۔ مغرب کی سیاست و بالاتری سے عالمِ انسانی کو عظیم الشان نقصانات پہنچے ان کی نشان دہی کی جائے، غرض مغرب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس کے علوم و فنون کو پڑھایا جائے اور اس کے علوم و تجارب کو مواد خام (Raw Material) فرض کر کے اپنی ضرورت اور اپنے قد و قامت اور اپنے عقیدہ و معاشرت کے مطابق سامان تیار کیا جائے۔..... نظامِ تعلیم کی یہ بنیادی تبدیلی اور اس کی اسلامی تشکیل اگرچہ نہایت ضروری ہے، مگر دیر طلب اور طویل کام ہے اور اس کے لیے وسیع و عظیم صلاحیتوں اور وسائل کی ضرورت ہے، جدید اسلامی نسل کا معاملہ ایک دن کی تاخیر اور التوا کا روادار نہیں، مندرجہ بالا کام کی تکمیل تک (اور حقیقتاً اس کی موجودگی میں بھی) یہ کام ان اسلامی اقامت خانوں (Muslim Hostels) سے لیا جا سکتا ہے، جن میں یونیورسٹیوں اور کالجوں کے مسلم طلبہ قیام کریں اور وہاں اسلامی تربیت، اسلامی زندگی اور ماحول کے قیام، اور صالح ذہنی و روحانی غذا کے مہیا کرنے کا خاص اہتمام کیا جائے۔"[۱۷]

پھر مصنف نے دوسرے سبب کے طور پر مستشرقین کے افکار و تحقیقات کے وسیع اثرات کا ذکر کیا ہے، مولانا کے مطابق عالمِ اسلام کی موجودہ قیادت اور حکمراں طبقہ مغرب کا تعلیم یافتہ ہے، اس کے یہاں اسلام کے ماضی سے بدگمانی، مستقبل سے مایوسی اور اسلامی تعلیمات اور اسلامی شخصیات کے بارے میں شکوک و شبہات پائے جاتے ہیں۔ یہ سب کچھ استشراق کی محنت اور ان کی تشکیکی مہم کا نتیجہ اور ان کی تحقیقات کے اثرات ہیں۔ مولانا نے استشراق کے مذہبی و سیاسی محرک کے علاوہ اس کے اقتصادی محرک کا بھی ذکر کیا ہے۔ مستشرقین کی مثبت خدمات کا اعتراف کے ساتھ ان کے حقیقی مقاصد و خیالات پر روشنی ڈالی ہے۔ آخر میں اس صورت حال سے نمٹنے کے متعلق لکھتے ہیں:

"اس صورت حال کی اصلاح اور مستشرقین کی تخریبی و تشکیکی اثرات کو روکنے کی صرف یہی صورت ہے کہ ان علمی موضوعات پر مسلمان محققین و اہلِ نظر قلم اٹھائیں اور مستشرقین کی ان تمام قابلِ تعریف خصوصیات کو ملحوظ رکھتے ہوئے، بلکہ ان کو ترقی دیتے ہوئے جو ان کا حصہ سمجھی جاتی ہیں، مستند و صحت مند اسلامی معلومات اور نقطۂ نظر پیش کریں، یہ ایسی تصنیفات ہوں جو اپنی تحقیقات کی اصلیت (Originality) مطالعہ کی وسعت، نظر کی گہرائی اور عمق، مآخذ کے استناد و صحت اور اپنے

محکم استدلال میں مستشرقین کی کتابوں سے کہیں فائق وممتاز ہوں، ان میں ان کی تمام خوبیاں ہوں اور وہ ان کی کمزوریوں اور عیوب سے پاک ہوں، دوسری طرف ان مستشرقین کی کتابوں کا علمی محاسبہ کیا جائے اور ان کی تلبیسات کو بے نقاب کیا جائے، متن کے سمجھنے میں ان کی غلط فہمیوں اور ترجمہ واخذ مطلب میں ان کی غلطیوں کو واضح کیا جائے، ان کے مآخذ کی کمزوری اور ان کے اخذ کیے ہوئے نتائج کی غلطی کو روشن کیا جائے اور ان کی دعوت و تلقین میں ان کی جو بدنیتی، مذہبی اغراض اور سیاسی مقاصد شامل ہیں، ان کو طشت از بام کیا جائے اور بتایا جائے کہ یہ اسلام اور ملتِ اسلامیہ کے خلاف کیسی گہری اور خطرناک سازش ہے۔"(۱۸)

مصنف نے بڑی جرأت وصراحت کے ساتھ مشرق پر مغربی تہذیب کے چھا جانے کا تیسرا سبب اسلامی علوم کے زوال اور علماء کے فکری اضمحلال کو قرار دیا ہے، اور بہت وضاحت سے لکھا ہے:

"عالمِ اسلام کے جدید اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ اور ان لوگوں کی (جن کے ہاتھ میں حکومت و سیاست کی باگ دوڑ ہے) بے راہ روی، غلط اندیشی اور دین سے مایوسی کا کسی قدر سبب وہ جمود واضمحلال بھی ہے جو علوم اسلامیہ کے مرکزوں اور نمائندوں کے طور پر طویل مدت سے طاری ہے، اس جمود و اضمحلال کی وجہ سے یہ علوم جو نمو وارتقاء کی اعلیٰ صلاحیتوں سے بھرپور ہیں، اپنی صلاحیت وافادیت اور بدلتی ہوئی زندگی کی رہنمائی کی قابلیت کا وہ روشن ثبوت پیش نہیں کر سکے جو تنازع للبقاء کے اس دور میں درکار تھا۔"(۱۹)

مصنف نے اس کا حل پیش کرتے ہوئے واضح کیا ہے کہ نہ صرف اسلامی علوم کو نئے دل نشین اسلوب میں پیش کرنے کی ضرورت ہے، بلکہ اس وقت "قانونِ اسلامی کی تدوینِ جدید کی ضرورت ہے"۔ فرماتے ہیں:

"اسلامی علوم، معارفِ قرآنی اور شریعتِ اسلامی کے لیے جس طاقت ور، مؤثر و دل پذیر و دل نشین تعبیر و تشریح اور اس کے لیے زبان وادب کے اس نئے دور میں جس اسلوب اور پیرایۂ بیان کی ضرورت تھی، وہ اگر نایاب نہیں تو کمیاب ضرور تھا، ایسے علماء خال خال پائے جاتے تھے، جو ان دینی حقائق کی ابدیت، زندگی کی صلاحیت اور اسلام کی فوقیت و برتری کا نقش و تجزیہ سے تہذیب جدید کے طلسم توڑ سکیں...... لیکن عالمِ اسلام میں ایک ایسی طاقت ور عالمگیر علمی تحریک کی کمی برابر محسوس کی جا رہی ہے، جو جدید طبقہ کا اسلام کے علمی ذخیرہ سے رشتہ و رابطہ قائم کر سکے، اسلامی علوم میں نئی روح پھونک سکے، اور اس حقیقت کو ثابت کر سکے کہ اسلامی قانون اور فقہ نہایت وسیع اور ترقی پذیر قانون ہے اور وہ ایسے ابدی اصولوں پر قائم ہے جو کبھی فرسودہ اور از کار رفتہ نہیں ہو سکتے، جس میں زندگی کے تغیرات و ترقیات کے ساتھ دینے کی پوری صلاحیت ہے اور جس کی موجودگی میں کسی وضعی وانسانی

قانون کی پناہ لینے کی ضرورت نہیں، یہی عصرِ حاضر کا وہ ضروری کام ہے، جو اسلامی ملکوں میں اور موجودہ اسلامی معاشرہ کو ذہنی و معاشرتی ارتداد سے بچا سکتا ہے، اور مغرب کی زدگی اور تجدد کے اس تیز دھارے کو روک سکتا ہے، جو عالم اسلام میں اس وقت اپنی پوری طغیانی پر ہے۔‘‘(۲۰)

اس باب کے اخیر میں مولانا نے ’’امید کی روشنی‘‘ کے عنوان سے لکھا ہے کہ دین کے داعیوں اور اسلام کے ترجمانوں کو چاہیے کہ وہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ کی تربیت واصلاح پر توجہ مرکوز کریں، اس لیے کہ قیادت ورہنمائی کے منصب پر یہی طبقہ فائز ہے، فکری ارتداد کا خطرہ اسی طبقہ سے ہے، اسلامی تحریکات کو پُر جوش کارکن اور اسلام کے مخلص شیدائی بھی اسی طبقہ میں پیدا ہوئے۔ مولانا لکھتے ہیں:

’’اس طبقہ سے اسلام کو بعض بڑے صحیح الخیال، عمیق النظر مفکر، اسلام کے شیدائی اور سرفروش مجاہد حاصل ہوئے، بہت سی دینی دعوتوں اور اسلامی تحریکات کو اسی طبقہ سے پُر جوش داعی، اور باعمل سپاہی ملے، مشرقِ وسطیٰ میں سید جمال الدین افغانی، شیخ محمد عبدہٗ، اور شیخ حسن بنّا کو اور ہندوستان میں تحریک خلافت سے لے کر عصرِ حاضر کی تمام دینی تحریکات کے قائدین کو اسی طبقہ میں سے اپنے بہترین کارکن ہاتھ آئے، اب بھی اگر دین کے داعی بے لوث اور مخلصانہ طریقہ پر اس کو دین سے مانوس کرنے کی کوشش کریں، ان کے ذہن کی ان شکنوں کو دور کر دیں جو مغرب کی مخصوص مزاج کی تعلیم نے ڈال دی ہیں اور ایمان کی چنگاری کو متحرک کرنے میں کامیاب ہو جائیں، جو اب بھی ان کے دل و دماغ کے اندر دبی ہوئی ہے تو اب بھی اس طبقہ میں علامہ اقبال و محمد علی جیسے صاحبِ فکر افراد پیدا ہو سکتے ہیں...... عالمگیر صورت کی تبدیلی کے لیے اور عالمِ اسلام کے حالات میں انقلابِ عظیم پیدا کرنے کے لیے دین کے داعیوں کو اس طبقہ پر اپنی توجہ مرکوز کرنے کی ضرورت ہے کہ اسی طبقہ کی غلط اندیشی اور بے راہ روی نے عالمِ اسلام کو ذہنی ارتداد کے خطرہ میں مبتلا کر دیا ہے، اسلامی ممالک کا رخ خالص اسلامیت کے بجائے خالص مغربیت کی طرف موڑ دیا ہے اور عوام کو بے زبان گلّہ اور جانوروں کے ریوڑ کی طرح غیر اسلامی قیادت کے ہاتھ میں دے دیا ہے اور اسی طبقہ کی اصلاح سے دوبارہ ان ممالک کا رخ مغربیت سے اسلامیت کی طرف موڑا جا سکتا ہے۔‘‘(۲۱)

اس کے بعد مصنف محترم نے مغربی تہذیب کے تئیں تیسرے موقف کو بیان کیا ہے، یہاں قرآنی بصیرت کے ساتھ امتِ اسلامیہ کے مقام و منصب کی تعیین کی گئی ہے، اس کی دعوت کو واضح کیا گیا ہے اور پھر تفصیلی تجزیہ کے بعد یہ بتایا گیا ہے کہ جدید تاریخ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہوگا کہ امتِ مسلمہ مغربی تہذیب کے بالمقابل مستقل اور مجتہدانہ کردار اپنائے۔ مولانا لکھتے ہیں:

’’عصر جدید میں جبکہ مغربی تہذیب اپنے ارتقاء کے آخری نقطہ پر پہنچ گئی ہے، اور مسلم ممالک

اپنے مخصوص حالات اور تاریخ کی بنا پر اس میں مساویانہ حصہ نہیں لے سکتے اور بالفرض ایسا ممکن ہو تو ان کے لیے اپنے عقیدہ، مسلکِ زندگی، مقاصد اور مخصوص نوعیت کی بنا پر ایسا کرنا ممکن اور جائز بھی نہیں، یہ ان کی ملی موت اور اجتماعی خودکشی کے مرادف ہے، اس حالت میں تقلید و پیروی اور انکار و سلبیت کے درمیان ایک محفوظ، بلند و باعزت راہ ہے، یہ نہ صرف ان ممالک کے منصب و مقام کے شایانِ شان ہے، بلکہ تاریخ جدید کا سب سے بڑا انقلاب انگیز اقدام اور وقت کا سب سے اہم اور مقدس کام ہے۔ یہ ہے خود تہذیبِ جدید کی رہنمائی، اس میں زندگی کی نئی روح پھونکنا، اس کو صالح مقاصد اور سفر کی صحیح منزل عطا کرنا، اس کو نبوت کی عطا کی ہوئی ایمان و محبت کی دولت سے آشنا کرنا اور اس کی اصلاح و تکمیل کی وہ خدمت جو صرف مسلم ممالک ہی انجام دے سکتے ہیں اور جس کی اس عہد میں کوئی جرأت نہیں کر رہا ہے۔"(۲۲)

مذکورہ بالا سطور میں نہ صرف کتاب کا تعارف پیش کیا گیا، بلکہ اس کی فکر بھی کشید کر پیش کرنے کی کوشش کی گئی، اور یہ بھی واضح ہو گیا کہ کتاب اس وقت وجود میں آئی تھی، جب عالم اسلام میں یہ کشمکش جاری تھی، بلکہ یوں کہیے کہ اپنے پاؤں پسار رہی تھی اور اپنے نقطۂ عروج کو پہنچ رہی تھی، مسلم ممالک کو مغربی رنگ میں رنگنے کے سارے طریقے بروئے کار لائے جا رہے تھے۔ اب صورت حال بدل چکی ہے، اب تو عالمِ اسلام پر مغرب کا تہذیبی، سیاسی اور عسکری تسلط مکمل ہو چکا ہے، صرف بعض طاقتیں ہیں جو کفرِ اجباری سے کفرِ اختیاری کا سفر شروع کر چکی ہیں، یا مغرب کی بالادستی کو چیلنج کر رہی ہیں، ورنہ عمومی طور پر عالمِ اسلام زبان و عمل سے مغرب کی بالادستی قبول کر چکا ہے، بلکہ بلادِ عرب میں مغربی تہذیب کی طرف سو فیصد رجوع کی تحریک چل رہی ہے، سعودی عرب کا وژن ۲۰۳۰ء یہی منصوبہ رکھتا ہے، لیکن حل اب بھی وہی ہے جو اس کتاب کے اس باب میں پیش کیا گیا ہے کہ اس عالمگیر رجحان کے سدِّباب کے لیے سب سے پہلے نظامِ تعلیم اور نصابِ تعلیم پر توجہ مرکوز کرنی ہو گی اور اسلامی تعلیمات کی زندگی کی صلاحیت کو طاقت ور عصری اسلوب میں پیش کرنا ہو گا۔

اب ہم اصل مسئلہ کی طرف آتے ہیں کہ ہمارے نزدیک پاکستان میں اس کتاب کے خلاف احتجاج کا اصل سبب کیا تھا؟ یاد رکھنا چاہیے کہ تحریکات و شخصیات اور حکومتوں کے رجحان کو اس وقت تک صحیح طور پر نہیں سمجھا جا سکتا، جب تک پسِ منظر میں موجود سیاسی رجحان اور مذہبی تعصب کو نہ سمجھا جائے۔ مذہب اور مذہبی نعروں، علماء کی ظاہری پذیرائی، اسلامی موضوعات پر کانفرنسوں سے حکومتوں کے رجحانات کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ مولانا نے خود اس کتاب میں اشارہ کیا ہے کہ حکومتیں اپنے مقاصد کے لیے یہ سب کچھ کرتی ہیں، اس کو یوں سمجھیے کہ ایک زمانے میں سعودیہ نے جہاد کی سرپرستی کی، جہاد پر لٹریچر کو وہاں کی وزارت نے خوب شائع کیا اور تقسیم کیا، پھر وہ دور آیا کہ جہاد کو دہشت گردی کا مترادف بنا دیا۔ ایک زمانے میں سعودیہ میں پورے تعلیمی اسٹرکچر پر اخوانی علماء قابض تھے اور ان کی خوب پذیرائی ہوئی تھی، پھر وہ دور آیا کہ اخوان کو ختم کرنے کے لیے سعودیہ نے دولت کے دریا بہا دیے اور اب تو فلسطینی محاذ کے مجاہدوں کو بھی دہشت گرد قرار دے دیا، ایک وقت وہ تھا جب سلفیت اور کتاب و سنت کا غلغلہ تھا اور اب "معتدل اسلام" کی دُہائی ہے، کبھی شیعوں کے خلاف تکفیری لٹریچر سے مکتبات

اٹے پڑے تھے، مگر سیاست کا رخ بدلا تو اب یہ سب لٹریچر مکتبات سے اٹھالیا گیا اور اخوت وسفارت کے تذکرے کیے جانے لگے، آپ کے لیے یہ بات لائقِ تعجب ہوسکتی ہے کہ عالمِ عربی اور حجاز میں مولانا علی میاںؒ کی جس وقت زبردست پذیرائی ہورہی تھی اُس وقت بھی حکومتِ سعودیہ نے مولانا کے مضمون بین الجبایۃ و الھدایۃ پر پابندی عائد کی تھی، یہ مضمون مولانا نے حج کو تجارت بنادینے کے رجحان کے پسِ منظر میں لکھا تھا۔ یہ ڈاکٹر سعید رمضان کے مجلہ المسلمون کے اداریہ کے طور پر شائع ہوا تھا۔ اب تو مولانا کے ردۃ ولا أبا بکر لھا جیسے رسائل کو تطرف و تشدد کا سبب قرار دیا جارہا ہے۔ سیاست کی کرشمہ سازی آپ یوں سمجھیے کہ حکومتِ سعودیہ نے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اور علامہ یوسف القرضاوی جیسی بیسویں صدی کی تینوں عبقری شخصیات کی پذیرائی کی اور ان کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انھیں فیصل ایوارڈ سے نوازا اور اب ان تینوں کی کتابوں پر پابندی عائد کردی گئی، ان کے ذکر کو بھی غیر مستحب قرار دے دیا گیا اور آخرالذکر کو تو دہشت گردوں کا سردار قرار دیا گیا، آپ کے لیے یہ بات حیرت انگیز ہوگی کہ جن دنوں مولانا کی شاہ فیصل سے راہ ورسم تھی، ان دنوں بھی مولانا کی زیرِ بحث کتاب حجاز میں ممنوع تھی اور یہ بات مولانا مرحوم کے علم میں تھی، حالاں کہ مولانا کی خواہش وتمنا کیا تھی، وہ دیکھیے اور اہلِ حرم کا رویّہ دیکھیے:

> ”اس کتاب میں بتایا گیا ہے کہ عالم کی تعمیرِ نو میں اب کن حقائق و واقعات کا لحاظ اور کن پہلوؤں کی رعایت کرنی ہوگی اور یہ کام خود اپنے ملکوں میں جو حرم کی دیوار کے زیرِ سایہ ہیں، کتنا پیچیدہ اور کتنا ضروری ہوگیا ہے؟ اگر اہلِ حرم کو اس کام کی عظمت و ضرورت کا کسی درجہ میں احساس ہوگیا تو مصنف کی آرزو برآئی اور اس کی کوشش رائیگاں نہ گئی۔“(۲۳)

پاکستان میں مذہبی نعروں اور مسلکی عصبیت کا استعمال بہت عام رہا ہے، وہاں تو شدت پسندی کا عالم یہ رہا ہے کہ کتنے علماء اور عام لوگ موت کی نیند سلادیے گئے، تحفظِ ناموسِ رسالت، تحفظِ ناموسِ صحابہ اور شیعیت وغیرہ کا سیاسی استعمال حکومتی و مذہبی ہر دو سطح پر خوب کیا گیا۔ ابھی حالیہ الیکشن کے بعد جب عمران خان کی طرف سے ایک شیعہ تنظیم سے اتحاد کی بات کی گئی تو سوشل میڈیا پر شیعی فکر و مسلک کے خلاف مخصوص قسم کی تحریروں کا سیلاب آگیا، اور غالی شیعی فکر، تبرابازی اور ناموسِ صحابہ سے مصالحت کرنے کا عنوان لگا کر عمران خان کی دھجیاں اڑادی گئیں۔ دوسرے ہی دن جب مولانا فضل الرحمٰن صاحب نے عمران کی حمایت کا اعلان کیا تو یہ سارے مذہبی جذبات ٹھنڈے پڑگئے اور تمام نعرے سوشل میڈیا سے غائب ہوگئے۔

ہم اس کتاب کے متعلق حالیہ واقعہ کو بھی اسی سیاسی اور مذہبی تعصب کے زاویے سے دیکھتے ہیں۔ اس کتاب میں مصنف محترم نے ڈاکٹر محمد اقبال کی مغربی تہذیب وافکار پر تنقید کا ذکر کرتے ہوئے پاکستان کا تذکرہ کیا ہے اور مدلل طور پر بیان کیا ہے کہ پاکستان کا وجود ”جدید اسلامی تجربہ گاہ“ کے طور پر ہوا تھا، اسلامی شریعت اور اسلامی نظام کے نفاذ کا نعرہ دیا گیا تھا۔ مولانا نے ڈاکٹر اقبال کے تصورِ پاکستان کے متعلق لکھا ہے:

> ”ان کو پورے اخلاص کے ساتھ اس کا یقین اور احساس تھا کہ ایک ایسا خود مختار خطہ مسلمانوں

کے لیے بے حد ضروری ہے، جہاں اسلامی زندگی کا ''عمل'' اپنے سارے شعبوں اور پہلوؤں کے ساتھ جاری رہ سکے اور شریعتِ اسلامی اور زندگی کا اسلامی طریقہ اپنی خداداد صلاحیتوں اور جوہر کا آزادی کے ساتھ اظہار کر سکیں''۔ (۲۴)

پھر مولانا نے لیاقت علی خاں کا حوالہ دیتے ہوئے ان کی تقریروں کے اقتباسات نقل کیے ہیں:

''پاکستان ہمارے لیے ایک تجربہ گاہ ہے اور ہم دنیا کو دکھلائیں گے کہ تیرہ سو برس پرانے اسلامی اصول کس قدر کارآمد ہیں... ہم نے پاکستان کا مطالبہ اس بنا پر کیا تھا کہ مسلمان اپنی زندگی اسلامی احکام کے قالب میں ڈھالیں، ہم نے ایک ایسے معمل کے قیام کا مطالبہ کیا تھا، جہاں ایک ایسی حکومت بنائی جا سکے جو اسلامی اصولوں پر مبنی ہو، جن سے بہتر اصول دنیا پیدا نہیں کر سکی۔'' (۲۵)

پھر مولانا نے اس تجربے اور منصوبہ کی ناکامی اور اس کے اسباب کا ذکر کیا ہے اور یہ حقیقت واقعہ ہے کہ وہاں اسلام اپنی صحیح شکل اور تصورِ پاکستان کے زاویے سے ہمیشہ معدوم ہی رہا، مذہبی طبقہ نے اس کے نفاذ کی کبھی سنجیدہ کوشش نہیں کی، مسلکی تشدد پر جس قدر صلاحیتیں خرچ کی گئیں، اس قدر اسلامی نظام کے نفاذ اور اس کے لیے افراد سازی پر توجہ مرکوز نہ کی گئی، آج تک اسلامی نظریاتی کونسل کی ایک بھی سفارش پر عمل درآمد نہ ہوا۔ مجھے مفتی تقی عثمانی صاحب کی ایک تقریر کا اقتباس یاد آتا ہے، مفتی صاحب نے ذکر کیا تھا کہ جن دنوں میں شریعہ اپیلیٹ کا جج تھا، چیف جسٹس سے میں درخواست کرتا کہ حرمتِ سود کا مقدمہ سماعت کے لیے لگایا جائے تو وہ کہتے کہ اس کی کیا ضرورت ہے، کسی کی طرف سے کوئی مطالبہ تو ہوتا نہیں، مفتی صاحب نے نہایت غمگیں لہجہ میں کہا تھا کہ علماء کی طرف سے اس کے لیے ایک بھی سنجیدہ احتجاج نہیں کیا گیا۔ اور اب تو اس پر فیصلہ بھی آ گیا، لیکن نفاذ کب ہو گا خدا کی جانے! اس ناکامی کے پیچھے دراصل وہی اسباب کارفرما ہیں جو دیگر ممالک کا ناسور ہیں، وہاں بھی وہی مغربی نظامِ تعلیم نافذ ہوا جس کے بطن سے اسلامی نظام کے داعی تو نکل نہیں سکتے، ہاں الحاد وارتداد کے داعی ضرور پیدا ہوئے ہیں اور پاکستان میں تو ملحدین و تجدد پسندوں کا گروہ تشویش ناک حد تک آگے بڑھ رہا ہے، پھر یہ کہ وہاں قیامِ پاکستان کے مقاصد سے انحراف کرتے ہوئے سیکولرزم اور تجدد پسندی کو ہی اپنایا گیا، سب کچھ جوں کا توں مغرب سے لیا گیا، تقلید کی بدترین مثال پیش کی گئی، عمومی طور پر مذہبی طبقہ یا تو اس سے راضی رہا، یا اس کا مؤید رہا، یا اس پر خاموش رہا، فوج، بیوروکریسی اور حکمرانوں میں اسی کے محافظ و داعی رہے، جس کے نتیجے میں سیاسی طور پر وہاں مغربی تسلط کو پنجے گاڑنے اور نئی نسل کو اپنا دیوانہ و علم بردار بنانے میں بڑی کامیابی ملی، اس کتاب کے خلاف مذہبی طبقہ کے احتجاج کو ایک تو ہم اسی سیاسی تناظر میں دیکھتے ہیں۔ دوسرا سبب مذہبی تعصب بھی ہے۔ یہ درست ہے کہ اب حالات پہلے کی طرح نہیں رہے ہیں، لوگوں کی آپس میں رسم وراہ ہے، اسٹیج شیئر کیے جاتے ہیں، عوام کو دکھانے کے لیے، اتحاد کے عنوان سے جلسے بھی کیے جاتے ہیں، لیکن دلوں میں جو باتیں جاں گزیں ہیں، وہ بہر حال نہیں نکلی ہیں، جس کا مظاہرہ وقتاً فوقتاً ہوتا رہتا ہے، مصنف محترم نے تصورِ پاکستان پھر مقاصدِ پاکستان سے انحراف اور جدید اسلامی تجربہ کی ناکامی اور اس کے اسباب کا ذکر کرتے ہوئے ''دینی رہنمائی کا نازک کام'' عنوان قائم کیا ہے، اس عنوان

کے تحت فکرِ اسلامی کے علم برداروں کی ضرورت، مطلوب صلاحیت و خصوصیات کی طرف اشارہ کیا ہے اور پھر اسی ضمن میں وہاں کی جماعت اسلامی کا ذکر کیا ہے کہ اس کے پاس وہ خصوصیات موجود تھیں جو دینی قیادت ورہنمائی اور حدی خوانی کا فریضہ انجام دینے کے لیے ضروری تھیں۔ مولانا کے تجزیہ کے مطابق ایک طرف اس جماعت نے پاکستان میں اسلام کے نفاذ کا پُرزور مطالبہ کیا۔ دوسری طرف اس کے بانی میں ایسی متعدد خصوصیات جمع تھیں جو دینی قیادت کے منصب بلند پر انھیں پہنچا سکتی تھیں۔ تیسری جانب اس کے پاس مغربی افکار و تہذیب کی تنقید کا وافر لٹریچر موجود تھا، جدید مکاتبِ فکر اور رجحانات و فلسفوں سے واقفیت کے ساتھ اسلام کی تعلیمات اور ان کی زندگی کی صلاحیت پر مکمل عقیدہ تھا۔ ظاہر ہے کہ مختلف مذہبی اکائیوں کی موجودگی میں مولانا کا یہ صریح اعتراف لوگوں کے لیے ناقابل قبول تھا۔ یہاں صرف فکری اختلاف اور نظریاتی دوری ہی نہیں، بلکہ مذہبی تعصب نے اس کو لائقِ اعتنا نہ سمجھنے میں اپنا مکمل کردار ادا کیا، حالاں کہ مصنف محترم نے کمال دیانت داری سے آئندہ سطور میں جماعت کی اپنی غلطیوں، اندرونی انتشار، بیرونی مخالفتوں، فقہی و کلامی اختلاف اور حکومت کی طرف سے کھڑی کی گئی رکاوٹوں کی طرف بھی اشارہ کر دیا ہے، ان ہی سطور میں مولانا نے جماعت کے اپنا کردار نہ ادا کر پانے کے اسباب میں یہ صراحت بھی بڑی دیانت داری سے کر دی ہے:

> ”...اور کچھ اس کے خلاف ان تمام عناصر کے متحد ہو جانے کے سبب سے جن کو اس کے اسلامی نظام کے اور اسلامی دستور کے نعرہ میں اپنا مفاد اور اپنا سیاسی متقبل خطرہ میں نظر آتا تھا.....۔“[۲۶]

یہ ہے وہ تصویر جو اس قضیہ کے پسِ منظر میں سامنے آتی ہے اور ہم کو بھرپور دعوتِ فکر و عمل دیتی ہے کہ ہمیں ایک طرف تو ان اسباب کو زمینی سطح پر اختیار کرنے کی ضرورت ہے، جو مغربی تہذیب کے تسلط سے ہمیں آزاد کر سکیں، نئی نسلوں کے ایمان کا تحفظ کر سکیں، اسلامی تشخص کو بچا سکیں، الحاد کی راہیں مسدود کر سکیں، ذہنی ارتداد کے خطرے کو کم کر سکیں، دوسری طرف کم از کم ہمیں اپنے مذہبی رویّوں اور مسلکی و فکری اختلافات پر از سرِ نو غور کرنے کی ضرورت ہے۔ عہدِ معاصر کی ضروریات کو ملحوظ رکھتے ہوئے فکرِ اسلامی کو اس کے وسیع کینوس میں دیکھنے اور برتنے کی ضرورت ہے، بغیر اس کے ہم داخلی انتشار سے محفوظ نہیں رہ سکتے، جدید علمِ کلام یا علمِ کلام کے جدید تقاضوں اور اس کے وسیع دائروں سے واقف ہو کر خارجی دشمنوں سے نمٹنے کی ضرورت ہے، بغیر اس کے خارجی حملوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے، جس طرح حضرت مفکرِ اسلامؒ نے اختتام اس پر کیا ہے کہ ”اب دیکھنا یہ ہے کہ کون سا اسلامی ملک اس کارِ عظیم کی ہمت کرتا ہے، جس سے زیادہ انقلاب انگیز، عہدِ آفریں اور حیات بخش کوئی کام اس دور میں نہیں ہو سکتا۔“[۲۷]، (اور یہ وہی کام ہے جس کا ذکر گذشتہ سطور میں تیسرے موقف کے حوالے اور اس طوفان کے سدِّ باب و علاج کے ضمن میں گذر چکا)، اسی طرح ہم یہ کہتے ہیں کہ اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ کون سے خوش نصیب ادارے اور اہلِ علم ہیں جو اس کا بیڑا اٹھاتے ہیں اور ان دونوں ضروریات کی تکمیل کے لیے تن من دھن کی بازی لگاتے ہیں، تاکہ بیک وقت ملت کو خارجی تسلط اور داخلی انتشار سے تحفظ فراہم کیا جا سکے اور جمود و تجدد کی نکیر کرتے ہوئے کارِ تجدید کو جاری کیا جا سکے۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ جمود و تعطل اور بے جا تعصب کی کوکھ سے ہی تجدد جنم لیتا ہے، جو بسا اوقات الحاد کے دروازے تک

لے جاتا ہے اور فکری ارتداد کی راہیں ہموار کرتا ہے، اگر اجتہادی فکر زندہ رہے، صحیح بنیادوں پر کارِ تجدید انجام پاتا رہے، عصری تقاضوں کے مطابق فکری و کلامی رہنمائی ہوتی رہے تو بیرونی حملوں کی راہیں نہ صرف مسدود ہوں گی، بلکہ شکوک و شبہات اور ذہنی ارتداد کی وبا پر بھی قابو پایا جاسکے گا، اسلامی تعلیمات، ان کی زندگی اور صلاحیت پر اعتماد بحال ہو سکے گا اور پھر دنیا کے لیے وہ باعثِ کشش بھی ثابت ہوں گی۔ وما ذلك على الله بعزيز۔

حوالہ جات

(۱) موقف الشيخ أبي الحسن الندوي من الأفكار المعاصرة، ص ۱۳، طبع اول ۲۰۱۴ء، علی گڑھ

(۲) پرانے چراغ، جلد اول، ص ۳۰۴، طبع پنجم ۲۰۰۴ء

(۳) محولہ بالا، ص ۳۱۴-۳۱۵

(۴) محولہ بالا، ص ۳۱۳-۳۱۴

(۵) محولہ بالا، ص ۳۱۷-۳۱۸

(۶) کاروانِ زندگی، ج اول، ص ۳۱۴-۳۱۶، طبع پنجم ۲۰۱۲ء

(۷) مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش، ص ۱۲۹، طبع ہفتم، ۲۰۱۴ء

(۸) سورۃ ق، آیت ۱۸

(۹) ابوداؤد، رقم ۴۹۹۲

(۱۰) کاروانِ زندگی، ج اول، ص ۳۶۹ طبع پنجم ۲۰۱۲ء

(۱۱) مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش، ص ۱۱

(۱۲) محولہ بالا، ص ۱۲

(۱۳) محولہ بالا، ص ۱۸

(۱۴) محولہ بالا، ص ۵۱-۵۲

(۱۵) محولہ بالا، ص ۵۴

(۱۶) محولہ بالا، ص ۱۵۷-۱۵۸

(۱۷) محولہ بالا، ص ۲۵۳-۲۵۴

(۱۸) محولہ بالا، ص ۲۶۷-۲۶۸

(۱۹) محولہ بالا، ص ۲۶۹

(۲۰) محولہ بالا، ص ۲۷۰-۲۷۱

(۲۱) محولہ بالا، ص ۲۷۵-۲۷۶

(۲۲) محولہ بالا، ص ۳۰۲-۳۰۳

(۲۳) محولہ بالا، ص ۱۰

(۲۴) محولہ بالا، ص ۱۲۰

(۲۵) محولہ بالا، ص ۱۲۱- ۱۲۲

(۲۶) محولہ بالا، ص ۱۲۹

(۲۷) محولہ بالا، ص ۳۱۵

☆☆☆

علامہ شبلی نعمانیؒ کے تعلیمی افکار اور اصلاحی اقدامات

ڈاکٹر ظفر الاسلام اصلاحی

علامہ شبلی نعمانیؒ (۴؍جون ۱۸۵۷ء-۱۸؍نومبر ۱۹۱۴ء) ''عہدِ جدید کے معلمِ اول'' کی حیثیت سے معروف ہیں[۱]۔ ''حیات شبلی'' کے پہلے ایڈیشن (۱۹۴۳ء) کے دیباچہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ علامہ مرحوم کے لیے یہ خطاب سب سے پہلے ان شاگردِ رشید و ممتاز عالمِ دین اور اوّلین ناظمِ دارالمصنفین مولانا سید سلیمان ندویؒ نے اس دیباچہ میں ''عہدِ جدید کا معلمِ اوّل'' کے عنوان سے ایک ذیلی سرخی کے تحت استعمال کیا تھا[۲]۔ یہاں یہ ذکر بھی اہمیت سے خالی نہ ہوگا کہ اس سے تقریباً ۳۰؍برس قبل علامہ شبلی کے قریبی رفیق جناب مہدی حسن افادی نے ۱۹۱۳ء میں (یعنی علامہ کی وفات سے ایک سال قبل) تاریخ نگاری میں علامہ کی خدمات پر ایک مضمون ''ملک میں تاریخ کا معلم اوّل یعنی شمس العلماء علامہ شبلی نعمانی'' کے عنوان سے تحریر کیا تھا۔ یہ مضمون پہلی بار ۱۹۱۳ء میں علامہ شبلی کے شاگرد سجاد حیدر یلدرم کے رسالہ نقاد [آگرہ] میں شائع ہوا تھا، بعد میں یہ ان کے مجموعۂ مضمون ''افاداتِ مہدی'' کا حصہ بنا[۳]۔ مزید براں علامہ شبلی سے متعلق ممتاز اسکالر و معروف نقاد اور سابق پروفیسر شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ڈاکٹر خورشید الاسلام مرحوم کا یہ قول بہت مشہور ہے: ''شبلی پہلے یونانی تھے جو ہندوستان میں پیدا ہوئے''[۴]۔ یہ امر بحث طلب ہے کہ عہدِ جدید کا معلمِ اوّل کون تھا، لیکن اس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں کہ برّصغیر میں دورِ زوال کے بعد ملتِ اسلامیہ کی نشاۃِ ثانیہ میں علامہ شبلی کا کلیدی کردار رہا ہے۔ واقعہ یہ کہ فکری و عملی میدان میں علامہ شبلی کی شخصیت بڑی متنوع اور کثیر الجہات تھی۔ درس وتدریس، تعلیم و تربیت، مطالعہ و تحقیق، تصنیف و تالیف، سماجی، ملی و ملکی و بین الاقوامی مسائل میں کون سا ایسا پہلو ہے، جن میں ان کی جدتِ افکار کی جلوہ گری نہ پائی جاتی ہو اور ان کی اصلاحی کوششوں کے تابندہ نقوش نہ ملتے ہوں۔

علامہ شبلیؒ کی خدمات کا ایک نمایاں پہلو یہ ہے کہ مذہبی، سماجی، ثقافتی، تعلیمی، تصنیفی اور انتظامی مختلف میدانوں میں اصلاحات کے لیے ان کی مساعیِ جمیلہ جاری رہیں، لیکن ان کی نگارشات اور علمی، تعلیمی اور ملی سرگرمیوں کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ تعلیم، تعلیمی ادارے اور تعلیمی اصلاحات ان کا پسندیدہ موضوع رہا ہے، اور ان سب میں نظامِ تعلیم و تربیت میں اصلاح ان کا خاص میدانِ کار رہا ہے، اور کیوں نہ ایسا ہو جب کہ تعلیم ایسی روشنی ہے جس سے انسانی زندگی کا ہر شعبہ منور ہوتا ہے اور سنورتا ہے۔ دوسرے یہ بھی پیشِ نظر رہے کہ علامہ شبلی بنیادی طور پر معلم تھے۔ تعلم و تعلیم، درس و تدریس اور مختلف علوم و فنون کی اشاعت سے انھیں گہرا شغف رہا ہے۔ ان کے حالاتِ زندگی اور روز مرہ مشاغل اس کے شاہد ہیں کہ علم سے ان کا رشتہ ہر حال میں قائم رہا۔ اعظم گڑھ، غازی پور، رام پور، سہارنپور، لاہور، علی گڑھ، حیدرآباد و لکھنؤ جہاں بھی وہ رہے (خواہ متعلم و معلم یا کسی علمی ادارہ کے منتظم کی حیثیت سے) تعلم و تعلیم، اشاعتِ علوم و فنون ان کا محبوب مشغلہ بنا رہا۔ واقعہ یہ کہ اسلاف میں بہت سے علماء

پوری زندگی اس ارشادِ نبوی ﷺ پر عمل پیرا رہے کہ ''عالم کی حیثیت سے نکلو، یا متعلم کی حیثیت سے یا [ان سے] محبت کرنے والے یا ان کی پیروی کرنے والے کی حیثیت سے، پانچویں نہ بنو ورنہ ہلاک ہو جاؤ گے''(۵)۔ اس حدیث کا بہت ہی واضح پیغام یہ ہے کہ کسی نہ کسی صورت میں علم سے رشتہ برقرار رہنا چاہیے۔ بلاشبہ علامہ شبلیؒ کی زندگی اس کا بہترین نمونہ تھی۔ مزید یہ کہ علامہ شبلی کی تقریری و تحریری صلاحیتیں خصوصی طور سے تعلیم کے میدان میں نمایاں ہوئیں اور خوب نمایاں ہوئیں۔ تعلیمی موضوعات پر ان کی تحریری یادگاریں کتابوں اور مضامین کے مجموعوں میں دستیاب ہیں اور اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کی اہمیت و افادیت آج بھی مسلم ہے، اور مصنفِ گرامی کی اصلاحات کا فیض جدید دور میں بھی جاری ہے، جیسا کہ ان سے متعلق عصرِ حاضر کے اہلِ قلم کے مطالعات سے واضح ہوتا ہے۔ اس لیے علامہ شبلی کے تعلیمی افکار کے مطالعہ کے ساتھ تعلیمی داروں اور نصاب و نظام کے تعلق سے ان کی اصلاحی کوششوں (جس کا دائرہ بہت وسیع رہا ہے) کا جائزہ افادیت سے خالی نہ ہوگا۔

یہ بخوبی معروف ہے کہ علامہ شبلی نے اے۔ ایم۔ او کالج علی گڑھ میں فارسی و عربی کے پروفیسر کی حیثیت سے تقریباً ۱۶/برس (۱۸۸۳-۱۸۹۸ء) تدریسی خدمت انجام دی اور بقول حبیب شبلی مولانا حبیب الرحمن خاں شروانیؒ کے نبیرۂ محترم پروفیسر ریاض الرحمن شروانی صاحب مرحوم (م ۴/نومبر ۲۰۲۱ء) ''ایم۔ او۔ کالج کے سب سے ممتاز استاد علامہ شبلی نعمانی اور سب سے نامور طالب علم مولانا محمد علی جوہر تھے''(۶)۔ ایک استاد کے فرائض منصبی انجام دینے کے علاوہ انھوں نے کالج میں دینی و مشرقی علوم کی ترویج اور اسلامی افکار و اقدار کی اشاعت کے لیے بھی قابل قدر خدمات انجام دیں۔ ان خدمات میں تدریس کے علاوہ کالج کے طلبہ کی دینی و اخلاقی تربیت میں سرگرم رہنا، سرسید کی ایماء پر تقریباً ۸/برس تک روزانہ ناشتہ سے قبل طلبہ کے سامنے قرآن کا درس دینا شامل تھا۔ مولانا سید سلیمان ندویؒ کے بیان کے مطابق مولانا شبلی کے درسِ قرآن سے کالج کے طلبہ میں قرآن کا ذوق پیدا ہونے لگا(۷)۔ مولانا کے درسِ قرآن سے مستفیض ہونے والوں میں مولانا محمد علی جوہرؒ بھی تھے۔ انھوں نے بعد میں اپنی آپ بیتی میں یہ تاثر ظاہر کیا تھا کہ ''روزانہ نصف گھنٹہ درسِ قرآن (جس سے کچھ ہی ماہ فیضیاب ہو سکا) کے بہت گہرے نقوش میرے دل و دماغ پر ثبت ہو گئے اور باقی زندگی میں اس کے اثرات، میں برابر محسوس کرتا رہا''(۸)۔ اسی طرح علامہ شبلی نے اپنے خطبات و لکچرس (بالخصوص عید میلاد النبی ﷺ کے موقع پر دیے گئے) کے ذریعہ سیرتِ نبوی ﷺ کے پیغام کو عام کرنے کی کوشش کی۔ بانیِ محترم سرسید احمد علیہ الرحمۃ کی فرمائش پر عربی میں سیرت کی درسی کتاب (رسالہ تاریخ بدء الاسلام) تالیف کی اور طلبہ کی آسانی کے لیے اپنے عزیز شاگرد اور علی گڑھ کالج کے طالب علم مولانا حمید الدین فراہیؒ (م ۱۹۳۰ء) کے توسط سے اس رسالہ کے فارسی ترجمہ کا اہتمام کیا۔ جناب محمد مقتدیٰ خاں شروانی (م ۶/دسمبر ۱۹۶۸ء) نے اس رسالہ (یا سیرت پر علامہ شبلی کی اسی ابتدائی کاوش کو) ان کے سیرتی شاہکار (سیرۃ النبی ﷺ) کا ''ایک ننھا سا تخم'' قرار دیا ہے(۹)۔ مزید براں کالج کیمپس میں سیرت نبوی ﷺ پر مجالس کا اہتمام اور اپنی رہائش گاہ پر اس کی داغ بیل ڈال کر ایک عام پروگرام کی شکل میں اسے مقبول بنا کر سالار جنگ منزل اور پھر اسٹریچی ہال میں اس کے انعقاد کا نظم کرنا بھی ان کی نیک کوششوں کا ایک اہم حصہ رہا ہے۔ ان سب کے علاوہ انھوں نے اپنی تصانیف سے کالج کو فائدہ پہنچایا اور اس کی نیک نامی میں اضافہ کیا، اس کا اعتراف سرسید اور ان کے

رفقاء کے یہاں بھی ملتا ہے۔

علامہ شبلی کی شخصیت کا یہ بھی ایک امتیازی پہلو ہے کہ وہ جدید وقدیم کے سنگم تھے، اور وہ قدیم وجدید میں امتزاج کی ضرورت وافادیت بھی اجاگر کرتے رہے۔ وہ، جیسا کہ معروف ہے، دو ایسے تعلیمی اداروں سے وابستہ رہے ہیں جو نصاب و نظامِ تعلیم اور اپنے قیام کے اغراض و مقاصد کے لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف سمت میں چلنے والے تھے۔ علامہ شبلی کے نظریۂ تعلیم کی وسعت یا تعلیمی افکار کی گہرائی میں دراصل ان کے اساتذہ ورفقاء کا بھی اہم کردار رہا ہے۔ ایک جانب بحیثیت متعلم اقانیمِ ثلاثہ مولانا محمد فاروق چریا کوٹی، مولانا احمد علی سہارنپوری اور مولانا فیض الحسن رحمۃ اللہ علیہم سے استفادہ کے بعد انہیں دینی و مشرقی علوم کے میدان میں مہارت نصیب ہوئی تو دوسری جانب قدیم تعلیم کی صلاحیتوں کو صیقل کرنے، عصری علوم کی قدر و قیمت کا احساس بیدار کرنے اور مطالعہ و تحقیق اور تصنیف وتالیف کے نئے منہج سے روشناس کرانے میں جدید فکر کے داعی اور عصری علوم کے فروغ کے زبردست محرک سرسید احمدؒ، ان کے ادارہ (ایم۔اے۔او کالج) اور اس سے وابستہ جدید تعلیم کے ماحول میں رچے بسے متعدد اساتذہ کی صحبتوں اور ان سے تبادلۂ خیال کا بھی حصہ رہا ہے۔ ۱۸۹۴ء میں "شمس العلماء" کے خطاب سے نوازے جانے پر کالج میں منعقدہ تہنیتی جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے علامہ شبلی نے برملا یہ اعتراف کیا تھا کہ علی گڑھ نے ان کی ذہنی و فکری اُفق کو مزید وسعت دی اور ان کی تصنیفی کاوشوں کے دائرہ میں تنوع پیدا ہوا(۱۰)۔ ان سب کے باوجود یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ علی گڑھ کے جدید ماحول اور لکھنؤ کی قدیم آب وہوا میں انھوں نے اپنی شناخت قائم رکھی، یعنی قدیم تعلیم کی قدر و قیمت کے اعتراف سے انھوں نے کبھی پہلو تہی نہیں برتی، جدید ماحول یا اس کی پروردہ شخصیات سے وہ کبھی مرعوب نہیں ہوئے، اس ماحول میں رہتے ہوئے وہ دینی تعلیم کی اہمیت وافادیت پر کھل کر اظہارِ خیال کرتے رہے۔ بلاشبہ اِسے اُن کی شخصیت کے ایک منفرد پہلو سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

علامہ شبلی کی شخصیت کی جامعیت پر یہ امر بھی شاہد ہے کہ وہ مشرقی تعلیم میں رچے بسے تھے اور عصری علوم پر بھی ان کی نظر تھی۔ انھوں نے قدیم وجدید تعلیم دونوں کے اداروں کے نظامِ تعلیم کو بہت قریب سے دیکھا تھا اور انہیں ان کے نصاب وطرزِ تدریس کا جائزہ لینے کا موقع بھی ملا تھا۔ مسلمانوں کے تعلیمی مسائل سے وہ خصوصی دلچسپی رکھتے تھے، وہ جہاں جاتے (چاہے اپنے ملک میں یا بیرونِ ملک) وہاں کے تعلیمی اداروں کے نظام کا مشاہدہ کرتے یا ان سے متعلق معلومات حاصل کرتے، ان کی خوبیوں و خرابیوں کا پتہ لگاتے اور اصلاح کے امکانات کی نشاندہی کرتے۔ اس طرح مسلمانوں کی تعلیم کے مسائل پر غور وفکر اور ان کا حل پیش کرنا ان کی علمی سرگرمیوں کا ایک اہم حصہ تھا۔ تعلیمی مسائل کے حل کی خاطر انھوں نے جو آراء و تجاویز اپنے مقالات وخطبات میں پیش کی تھیں وہ بڑی اہمیت کی حامل ہیں، اور ان کی معنویت وافادیت موجودہ دور میں بھی برقرار ہے، اس لیے کہ یہ ان کے وسیع مطالعہ، گہرے مشاہدے اور طویل تجربات پر مبنی ہیں۔ ان کے تعلیمی افکار کے اہم نکات یہ ہیں:

☆ مسلمانوں کی تعلیم کا مسئلہ کسی شخص کا انفرادی مسئلہ نہیں ہے؛ بلکہ یہ براہِ راست ان کی ملی زندگی اور اجتماعی مسائل سے منسلک ہے، اس لیے ان کی تعلیم کے نظم میں اس نکتہ کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔

☆ قدیم وجدید دونوں تعلیم کی ضرورت وافادیت اپنی جگہ مسلم ہے، لیکن موجودہ صورت حال میں دونوں میں اصلاح مطلوب ہے۔

☆ جدید علوم وفنون کی اشاعت اور عصری تعلیم کے پروان چڑھتے ہوئے ماحول میں دینی تعلیم کی توسیع واشاعت اور استحکام کی ضرورت مزید بڑھ گئی ہے؛ تاکہ دینی علوم کے ماہرین کثیر تعداد میں پیدا ہو سکیں اور وہ ملی واجتماعی مسائل کے حل کے لیے مؤثر ومفید ثابت ہوں۔

☆ قدیم وجدید تعلیم کے نصاب میں اس طور پر اصلاح درکار ہے کہ دینی مدارس کے نصاب میں کچھ عصری علوم کے مضامین شامل کیے جائیں اور مسلمانوں کی عصری تعلیم گاہوں میں دینیات کی تدریس کا اہتمام کیا جائے۔

☆ دینی تعلیم کے ساتھ جس جدید مضمون کی تعلیم سب سے زیادہ ضروری ہے وہ انگریزی زبان ہے، اس لیے کہ اس کے بغیر اسلام واسلامی نظام زندگی پر مغربی اسکالرس اور جدید دانشوروں کے اعتراضات سے نہ بخوبی واقفیت ہو سکتی ہے اور نہ ان کا جواب دینے کی اہلیت پیدا ہو سکتی ہے۔ مزید براں اسلام سے متعلق انگریزی میں مستند لٹریچر کی تیاری کے لیے بھی اس زبان کی مہارت درکار ہے، ورنہ جدید تعلیم یافتگان میں اسلام واسلامی تعلیمات کے مطالعہ کی طلب رکھنے والے غیروں کے تیار کردہ لٹریچر پر انحصار کریں گے اور ان کے سامنے اسلام واسلامی شریعت کی صحیح ترجمانی نہیں ہو پائے گی۔

☆ تعلیم کا ایسا نظام وضع کیا جائے کہ مختلف فنون کی اختصاصی تعلیم کا اہتمام ہو اور طلبہ اپنی دلچسپی ورجحان کے مطابق ان میں سے کسی ایک میدان کو منتخب کر سکیں، اس لیے کہ متخصصین کی ضرورت دن بہ دن بڑھتی جا رہی ہے۔

☆ قدیم تعلیم میں اصلاح کی ضرورت سے انکار نہیں؛ لیکن بلا ترمیم واصلاح بھی یہ افادیت سے خالی نہیں، اس لیے کہ اس تعلیم سے فیض یاب ہونے والوں سے بہت سی دینی، ملی واجتماعی ضروریات وابستہ ہیں۔

☆ قدیم وجدید دونوں تعلیم کا دائرہ کار جداگانہ ہے، ان کے فیض یافتگان میں اجنبیت کم کرنے اور تال میل پیدا کرنے کی ضرورت ہے؛ تاکہ دونوں مل کر مسلمانوں کی اجتماعی فلاح وبہبود کے کام انجام دے سکیں۔

ان سب کے علاوہ علامہ شبلی کے تعلیمی افکار کا ایک اور اہم پہلو یہ ہے کہ وہ اپنے زمانہ کے مخصوص حالات اور غیر مسلم مبلغین کی ریشہ دوانیوں کے پیش نظر مسلمانوں کے تعلیمی نظام بالخصوص مدارس کے تعلیمی سلسلہ کو ایک عظیم مقصد سے مرتبط کرنا چاہتے تھے اور وہ تھا اسلام کی تبلیغ واشاعت، اسلامی احکام وتعلیمات کی بہتر ومؤثر ترجمانی اور اسلام مخالف عناصر سے فکری طور پر نبرد آزما ہونے کے لیے باصلاحیت، مخلص وجفاکش افراد تیار کرنا۔ اہم بات یہ کہ علامہ شبلیؒ مدارس ہی کو ایسے افراد کی تعلیم وتربیت کا بہترین مرکز سمجھتے تھے اور اس مقصد سے ان کے نظام تعلیم وتربیت میں اصلاح وترقی کی جانب وہ اہل مدارس کو بار بار متوجہ کرتے رہے۔ برصغیر کے موجودہ حالات اور ملت اسلامیہ کو درپیش مسائل کے سیاق میں ممتاز مفکر ومصلح کے یہ افکار بڑی قدر وقیمت اور معنویت رکھتے ہیں۔ اس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں کہ جدید دور میں مسلم معاشرہ کو مختلف علوم وفنون

بالخصوص اسلامی و عصری علوم کے ماہرین کی ضرورت اس وجہ سے اور زیادہ بڑھ گئی ہے کہ اسلام و اسلامی نظامِ حیات پر نئے نئے اعتراضات و شبہات سامنے آرہے ہیں، دوسری جانب قرآن کریم، پیغمبر آخر الزماں ﷺ اور شریعت اسلامیہ کے خلاف پروپیگنڈہ کی مہم زور وشور سے جاری رہتی ہے۔ علامہ شبلیؒ صاف صاف یہ کہتے تھے کہ سوچنے کی بات ہے کہ عصرِ حاضر میں مروّجہ فلسفہ کا مقابلہ علوم جدیدہ کی واقفیت کے بغیر کیوں کر ہو سکتا ہے۔ بقول مولانا سید سلیمان ندویؒ ایک دفعہ نجی گفتگو میں استاد محترم نے مجھ سے فرمایا تھا: ''اب اس (یونانی علوم) کی جگہ نئے علوم ہیں، نئے مسائل ہیں، نئی تحقیقات ہیں۔ اب اس بات کی ضرورت ہے کہ ہمارے علماء انھی چیزوں سے واقف ہو کر اسلام کی نئی مشکلات کا حل نکالیں اور نئے شبہات کے تحقیقی جواب دیں''[11]۔ اسی طرح مدارس کے نظامِ تعلیم میں وقت کے تقاضے کے مطابق اصلاحی کوششوں کے ضمن میں علامہ شبلیؒ کی یہ رائے بھی لائقِ توجہ ہے کہ دینی علوم کے ساتھ انگریزی زبان کی تعلیم کی بڑی افادیت ہے۔ ان کا بہت ہی واضح موقف تھا کہ بدلتے ہوئے حالات میں انگریزی زبان سے واقفیت کے بغیر دعوتِ دین اور دفاعِ اسلام کی خدمت بخوبی نہیں انجام دی جاسکتی۔ وہ یہ بھی سوال اٹھاتے تھے کہ یورپ میں اسلام کی اشاعت انگریزی دانی کے بغیر کیوں کر ہو سکتی ہے، آریوں اور عیسائیوں کے مذہبی حملوں کا دفاع انگریزی جانے بغیر کیوں کر ہو سکتا ہے[12]۔ مزید یہ کہ علامہ مرحوم نہ صرف عربی درجات میں شروع سے آخر تک انگریزی زبان کی تعلیم درسیات میں شامل کیے جانے پر زور دیتے تھے؛ بلکہ وہ عام نصاب کی تکمیل کے بعد دو برس کے اختصاص کے مرحلہ میں خواہش مند طلبہ کے لیے انگریزی میں بھی اختصاص کی سہولتیں مہیا کرنے کے حق میں تھے[13]۔ وہ اس پر افسوس ظاہر کرتے تھے کہ قرآن کے مطالب اور رسول اکرم ﷺ کے حالات جارج سیل اور ولیم میور کی کتابوں سے اخذ کیے جاتے ہیں۔ اس سے نجات پانے کے لیے اس کے علاوہ اور کیا صورت ہے کہ مدارس کے طلبہ یا علومِ اسلامیہ کے اسکالرس انگریزی زبان میں بھی مہارت حاصل کریں۔ یہاں یہ ذکر اہمیت سے خالی نہ ہوگا کہ علامہ شبلیؒ نے اسی ضرورت کے تحت جب ندوۃ العلماء میں معتمدِ تعلیم کے فرائض انجام دیتے ہوئے انگریزی زبان کی تعلیم کو نصاب میں لازمی مضمون کے شامل کیا، تو دوسروں کے علاوہ خود ان کے بعض قریبی رفقاء اور تلامذہ (بشمول شاگردِ رشید مولانا سید سلیمان ندویؒ) کے ذہنوں میں اِس کی بابت کچھ تردّد تھا۔ بقول سید صاحب اس کے ازالہ کی خاطر استادِ محترم نے ایک آہِ سرد کھینچی اور فرمایا: ''دیکھ رہے ہو کہ انگریزی تعلیم کس تیزی سے پھیلتی جاتی ہے، اسی کے ساتھ عربی زبان کی تعلیم اعلیٰ مسلمان خاندان سے مٹتی جاتی ہے۔ اب نئے تعلیم یافتوں کی مذہبی واقفیت کا مدار انگریزوں کی کتابوں اور اسلامی کتابوں کے ترجموں پر رہ جائے گا، اُس وقت ہمارے مذہبی علوم کی کیا حالت ہوگی، اب یہی دیکھو! جب غیر مذہبی تعلیم یافتوں کو قرآن پاک سمجھنے کا شوق ہوتا ہے تو وہ اپنی اس پیاس کو سیل کے انگریزی ترجمۂ (قرآن) سے بجھاتے ہیں۔ فقہِ اسلامی کا مدار ہدایہ (فقہِ حنفی کی معروف کتاب) کے انگریزی ترجمہ [از ہملٹن] پر رہ گیا ہے، کیا یہ کام ہمارے علماء کا نہیں ہے؟[14]۔ اس ضمن میں مزید اہم بات یہ کہ ایک بار سید صاحب نے استادِ مکرم سے دریافت کیا کہ عربی کے ہر طالب علم کو انگریزی پڑھنے پر کیوں مجبور کیا جاتا ہے، مثلاً جو لوگ فقیہ بننا چاہتے ہیں، اُن کو انگریزی کیا کام آئے گی تو انھوں نے جواب میں برجستہ فرمایا:

''عجیب بات کہتے ہو، اگر فقہاء انگریزی جانتے اور ہماری فقہ کو انگریزی میں منتقل کر سکتے تو ہدایہ وغیرہ کے انگریزوں اور غیر مسلموں کے کیے ہوئے غلط سلط ترجمے آج عدالتوں میں سند نہ قرار پاتے''(۱۵)۔

مختصر یہ کہ معلم، مفکر، مصلح، سیرت نگار، مؤرخ، ادیب و شاعر مختلف حیثیتوں سے علامہ شبلیؒ کی شخصیت بڑی جامع رہی ہے، اسی طرح ان کی تصنیفی وتالیفی سرگرمیاں مختلف الجہات تھیں۔ انہوں نے اپنی تحریری صلاحیتوں سے کس طرح ملک اور بیرون ملک کے لوگوں کو فیض یاب کیا، اس کی ایک جھلک ان کے تلمیذِ رشید کی مصنفہ ''حیاتِ شبلی'' کے تعارفی کلمات کے ان اوّلین الفاظ میں دیکھیں: ''پیشِ نظر کتاب ایک ایسی ہستی کے اوراقِ سوانح ہیں، جس نے بتیس برس (۱۸۸۲ءتا ۱۹۱۴ء) تک ہندوستان اور ہندوستان سے باہر کی اسلامی دنیا کو اپنے قلم کی روانی سے سیراب، اپنی شعلہ نفسیوں سے گرم اور اپنی نواسنجیوں سے پُر شور رکھا''(۱۶)۔

مختصر یہ کہ ناچیز کی رائے میں ملت کی عظیم شخصیات بالخصوص علمِ دین کی ترویج اور اسلامی و مشرقی علوم کی اشاعت کے لیے اپنی صلاحیتوں اور توانائیوں کو وقف کر دینے والوں کی حیات و خدمات سے بڑے قیمتی اسباق ملتے ہیں، ان کے کارناموں کو پڑھ کر یا جان کر تعمیری و نفع بخش کاموں کی تحریک پیدا ہوتی ہے اور ملک وملت کے لیے کچھ کر گزرنے کا جذبہ بیدار ہوتا ہے۔

علامہ شبلیؒ کی حیات و خدمات سے جو قیمتی اسباق اخذ ہوتے ہیں وہ یہ ہیں:

(۱) ذہنی و علمی صلاحیتوں کا صحیح استعمال اور اس کے مفید نتائج۔

(۲) محنت و مشقت اٹھا کر اپنی صلاحیتوں کو پروان چڑھانے کی کوشش کرنا۔

(۳) وقت کی قدر و قیمت پہچاننا اور ذاتی فائدہ کے علاوہ دوسروں کے لیے نفع بخش کاموں میں اسے صرف کرنا۔

(۴) عصری تقاضوں کے تحت اسلوبِ نگارش میں تبدیلی لانا اور تحقیق و تصنیف کا نیا منہج اختیار کرنا۔

(۵) ذاتی مطالعہ و تحقیق کی روشنی میں یا کسی کے توجہ دلانے پر اپنی تقریری/تحریری غلطیوں و خامیوں کا بلا جھجھک اعتراف کرتے ہوئے ان کی تصحیح کرنا۔

اللہ کرے ہمیں علامہ شبلی کی حیات و خدمات سے حاصل ہونے والے ان اسباق سے فائدہ اٹھانے کی توفیق نصیب ہو اور ہماری علمی کاوشیں ملک وملت کے لیے مفید ثابت ہوں۔ آمین ثم آمین۔

آخری بات یہ کہ ''سیرۃ النبی ﷺ'' کو بجا طور پر علامہ شبلیؒ کی تصنیفی وتالیفی زندگی کے شاہ کار کی حیثیت حاصل ہے۔ بلاشبہ یہ بنیادی طور پر سیرت کی کتاب ہے، لیکن اس کے اس قیمتی پہلو کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ قرآن کریم نہ صرف یہ کہ اس کا اوّلین؛ بلکہ خاص ماخذ ہے، اس کے مباحث اور ان میں کثرت سے محولہ آیاتِ کریمہ اور ان کی ترجمانی و تشریح اس حقیقت کی شاہد ہیں۔ علامہ شبلی کی تصنیفی وتالیفی مصروفیات کا یہ پہلو بھی بڑا قابلِ قدر ہے کہ ان کا خاتمہ بالخیر اسی بابرکت کتاب ''سیرۃ النبی ﷺ'' کی تالیف پر ہوا۔ علامہ رحمۃ اللہ علیہ نے خود اپنے ایک قطعہ میں بڑے والہانہ انداز اور دل نشیں پیرایہ میں اس کا ذکر کیا ہے۔ اسے یہاں نقل کرنے کو جی چاہتا ہے، لیکن پہلے ان کے اس تاثر کو ملاحظہ فرمائیں، جسے انھوں نے اپنی اس وقیع

تالیف ’’سیرۃ النبی ﷺ‘‘ سے متعلق اپنے قریبی عزیز مولوی محمد سمیع کے نام خط (مورخہ ۷؍جنوری ۱۹۱۳ء) میں ظاہر کیا تھا اور پھر ایک قطعہ (جسے ان کے دل کی آواز کہا جاسکتا ہے) تحریر کیا تھا۔ علامہ شبلی کے کلمات اور قطعہ کو پڑھ کر ان کے صدائے دل کی تاثیر دل ودماغ میں نقش ہو جاتی ہے، ملاحظہ ہو:

’’سیرۃ النبی ﷺ بقدرِ امکان ہوتی جاتی ہے، یہ عمر بھر کا حاصل اور وسیلۂ نجات ہے۔

عجم کی مدح کی، عباسیوں کی داستاں لکھی — مجھے چندے مقیمِ آستانِ غیر ہونا تھا
مگر اب لکھ رہا ہوں، سیرتِ پیغمبرِ خاتم — خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا‘‘(۱۷)۔

واقعہ یہ کہ علامہ شبلی کی اس عظیم الشان علمی یادگار کا بہت ہی واضح پیغام یہ ہے کہ قرآن وسنت سے تعلق مضبوط کیا جائے اور روزمرہ زندگی کے ہر معاملہ میں انہیں عملی طور پر رہنما بنایا جائے۔ اللہ رب العزت ہم سب کو اس پیغام کو حرزِ جاں بنانے، یعنی قرآن وسنت کی دکھائی ہوئی شاہ راہ (صراط مستقیم) پر چلنے کی توفیق عنایت فرمائے۔ اللّٰہ ولی التوفیق وَھُوالمُستعَانُ۔

حواشی ومراجع

(۱) پیشِ نظر مضمون ’’عہدِ جدید کے معلم اوّل علامہ شبلی نعمانی۔ حسّاس مفکر، افکار واصلاحات‘‘ کے موضوع پر انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹیو اسٹڈیز، نئی دہلی کے زیر اہتمام ر باشتراک دینیات فیکلٹی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ۲۳-۲۴ اکتوبر ۲۰۲۱ء کو منعقدہ سیمینار/ویبینار کے اختتامی اجلاس میں خطبۂ صدارت کے طور پر پیش کیا گیا تھا۔ اس رسالہ میں اشاعت کے لیے دینے سے قبل اس پر نظرِ ثانی کے ساتھ کچھ ترمیم و اضافہ بھی ہوا ہے۔

(۲) سید سلیمان ندوی، حیاتِ شبلی، دارالمصنفین، اعظم گڑھ، ۱۹۴۳ء، ص: ۹

(۳) افاداتِ مہدی، یعنی ایم مہدی حسن مرحوم کا مجموعۂ مضامین، مرتبہ مہدی بیگم، معارف پریس، اعظم گڑھ، ۱۹۲۳ء، ص: ۲۱۸- ۲۷۲؛ خلیق احمد نظامی، علی گڑھ کی علمی خدمات، انجمن ترقی اردو، نئی دہلی، ۱۹۹۴ء، ص: ۱۰۳

(۴) خورشید الاسلام، شبلی، علی گڑھ میگزین، ۲۳/۱، اگست ۱۹۴۷ء، ص: ۱۱۸

(۵) ابن عبد البر، جامع بیان العلم وفضلہ، القاہرۃ، ۱۹۷۵ء، ص: ۳۰

(۶) ریاض الرحمن خاں شروانی، دھوپ چھاؤں [ستمبر ۱۹۴۱ء-جولائی ۱۹۴۹ء تک کے حالاتِ زندگی]، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۲۰۱۱ء، ص: ۹۸)

(۷) سید سلیمان ندوی، حیاتِ شبلی، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ۲۰۱۵ء، ص: ۱۹۶

(۸) ظفر الاسلام اصلاحی، سرسید وایم۔اے۔او کالج اور دینی مشرقی علوم [باب چہارم۔ ایم۔اے۔او کالج میں درسِ قرآن عہدِ سرسید میں]، اسلامک بک فاؤنڈیشن، نئی دہلی، ۲۰۰۱ء، ص: ۷۷

(۹) محمد مقتدیٰ خاں شروانی، علی گڑھ میں شبلی کا قیام، مقالاتِ یومِ شبلی، مرتبہ: عبید اللہ خاں، اردو مرکز، لاہور، ۱۹۶۱ء، ص: ۹۱

(۱۰) علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، ۲۹/۷، ۱۱/فروری ۱۸۹۴ء، ص: ۱۴۵-۱۴۶

(۱۱) حیاتِ شبلی، ص: ۴۷/دیباچہ

(۱۲) خطباتِ شبلی، مرتبہ سید سلیمان ندوی، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ۲۰۰۸ء، ص: ۹۵، ۹۳

(۱۳) خطباتِ شبلی، ص: ۶۴

(۱۴) حیاتِ شبلی، ص: ۴۷/دیباچہ

(۱۵) حیاتِ شبلی، ص: ۱۸۵

(۱۶) حیاتِ شبلی، ص ۳۳/دیباچہ

(۱۷) مکاتیبِ شبلی مرتبہ: سید سلیمان ندوی، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ۲۰۱۰ء، ۱/۹-۱۰، مکتوب بنام مولوی محمد سمیع، نمبر: ۵۵

قضیۂ فلسطین

فلسطین پر مسلمانوں کا دینی، تاریخی اور شرعی حق

محمد عبداللہ بن حافظ محمد شمیم
(متعلم: مدرسہ مظہر الاسلام، بلوچ پورہ، لکھنؤ)

(نوٹ: قضیہ فلسطین کے متعلق ایک مسابقہ (مضمون نگاری) کا انعقاد کیا گیا، اس مسابقہ کا اہتمام انجمن ابنائے قدیم مدرسۃ العلوم الاسلامیہ نے کیا، مسابقہ کے لیے دو موضوعات متعین کیے گئے تھے جو دو الگ گروپوں کے لیے تھے، اعلان کیا گیا تھا کہ پوزیشن حاصل کرنے والے طلبہ کے مقالات 'ندائے اعتدال' میں شائع کیے جائیں گے۔ چنانچہ اس شمارے میں گروپ (ب) میں دوم انعام حاصل کرنے والے طالب علم کا مقالہ شائع کیا جارہا ہے۔ ادارہ)

مقدمہ

سرزمین فلسطین تاریخ کے ہر دور میں نہ صرف عرب اور فلسطینی مسلمانوں کے نزدیک، بلکہ ساری دنیا کے مسلمانوں کے نزدیک مقدس و محترم رہی ہے۔ فلسطین کی تحریم و تقدیس کی حفاظت اور دشمنانِ اسلام سے اس کی بازیابی کے لیے صحابہ کرامؓ کے دور سے لے کر آج تک مسلمان اپنے پاکیزہ نفوس کو قربان کر رہے ہیں اور آخر ایسا کیوں نہ ہو دنیا کا وہ واحد خطہ ہے، جس کے لیے قران مجید کی مختلف سورتوں میں پانچ مرتبہ سرزمین بابرکت کا استعمال ہوا ہے۔ یہی وہ مقدس مقام ہے جس کی گود میں قبلہ اولیٰ مسجد اقصیٰ واقع ہے اور اس مبارک کو متبرک سرزمین کے اوپر بہت سے مسلمانانِ عالم کے دینی، شرعی اور تاریخی حقوق ہیں، جن کا احاطہ ایک مضمون میں تو درکنار ایک رسالے؛ بلکہ ایک ضخیم کتاب میں بھی ناممکن ہے؛ لیکن انگلی کٹا کر شہیدوں میں نام لکھانے کے مثل اس وسیع و عریض عنوان پر قلم اٹھانے کی جرأت کی جارہی ہے اس عزم کے ساتھ کہ ؎

حوصلہ ہم جوان رکھتے ہیں، مرتبہ عالی شان رکھتے ہیں   دل میں ہے لا إلٰہ إلا اللّٰہ، ہتھیلی پہ جان رکھتے ہیں

لیکن یہ بات نہ مناسب ہوگی نہ قابل تعریف ہوگی بلکہ غیر مناسب و نامعقول ہوگی کہ سرزمین فلسطین اور ملک فلسطین کا تذکرہ کیے بغیر اس پر واقع ہونے والے مسلمان عالم کے دینی، شرعی اور تاریخی حقوق کا تذکرہ کر دیا جائے، جیسا کہ اہل فلسطین کے لیے یہ بات معیوب ترین ہوگی کہ ملک ہندوستان کا تذکرہ کیے بغیر مسلمانانِ ہند پر ڈھائے جانے والے ظلم و ستم کا تذکرہ کر دیا جائے؛ چنانچہ سرزمین فلسطین کے مختصر تعارف کے متقاضی ہونے کے سبب سے اس کے مختصر تعارف کو بھی مذکور کیا گیا ہے اور فصول ثلاثہ پر مضمون ہذا کو منحصر کیا گیا ہے:

فصل اول

ارض مقدس کا مختصر تعارف

اسمائے فلسطین اور ان کے وجوہ تسمیہ:

عالم دنیا کی آباد کردہ مختلف اقوام نے عرض فلسطین کو مختلف ناموں سے یاد کیا ہے ان میں سے چند مذکور ہیں:

۱- ارض کنعان: ڈھائی ہزار قبل مسیح آباد ہونے والی کنعانی قوم کی جانب ارض مقدس کا یہ نام منسوب ہے، جنھوں نے جزیرۃ العرب سے شام کی جانب اپنا رخت سفر باندھا تھا۔ اسی نام کے ساتھ تورات میں بھی اس بستی کا ذکر آیا ہے؛ لیکن اس میں کنعان بن حام بن نوح کی جانب نسبت کرتے ہوئے اس کو یہ نام دیا گیا ہے۔[۱]

۲- ارض اسرائیل: قوم یہود جو اگرچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت یعقوب علیہ السلام اور دیگر انبیاء کرام علیہم السلام کی نسل میں سے ہے اور اصل کنعانی ہیں؛ لیکن ان سب کے باوجود چند سالوں کے بعد اپنے آباواجداد کے عمل سے انحراف کرتے ہوئے، انھوں نے اس کا نام ارض اسرائیل تجویز کیا۔ اس نام کو تجویز کرنے کی سب سے زیادہ اہم وجہ ان سب کے جدامجد حضرت یعقوب علیہ السلام کا دوسرا نام اسرائیل ہونا ہے، انھی کی جانب اس نام کی نسبت کی گئی ہے۔[۲]

۳- بلستین: ارض مقدس وسرزمین خیر وبرکت کا یہ نام اس قوم کی طرف منسوب ہے جو فلسطین کے شمالی اور جنوبی علاقے میں آباد تھی۔ بعض مؤرخین کا یہ خیال ہے کہ اسم بلستین کی نسبت اس قوم کی جانب کی گئی ہے جو بحر ابیض متوسط میں موجود جزیرۂ کریت سے قحط سالی کی وجہ سے سمندری راستے سے ہوتی ہوئی فلسطین پہنچی تھی، جن کو اہل مصر نے سمندری سفر کی مناسبت سے سمندری قوم کا خطاب دیا تھا۔ مذکورہ بالا نام کو اہل عرب نے منسوخ قرار دینے کے بعد ارض مقدس کا نام فلسطین تجویز فرمایا۔[۳]

۴- فلسطین: فلسطین کی وجہ تسمیہ کے سلسلے میں علماء کے مابین شدید اختلاف ہے، جس میں کے چار مشہور قول مذکور ہیں: (۱) یہ لفظ دو کلمات کا مجموعہ ہے: ''فلس'' جس کے معنی چھلکے کے ہیں اور ''طین'' جس کے معنی مٹی کے ہیں۔ قول لہٰذا میں اس جانب اشارہ ہے کہ اس سرزمین کے لوگ اہل زراعت تھے۔ (۲) بعض محققین کا یہ کہنا ہے کہ لفظ فلسطین فلست یا فلشت سے مشتق ہے، جس کے معنی دو ہیں نمبر ایک کسان اور نمبر دو زمین کو پھاڑنے والا مذکورہ بالا معانی سے بھی اہل فلسطین کے کاشتکار ہونے پر استدلال کیا جارہا ہے۔ (۳) لفظ فلسطین منسوب ہے قبیلہ فلسطیا کی جانب، جنھوں نے قحط سالی کے سبب سے جزیرۃ العرب سے ہجرت کی اور شام کے جنوبی حصے فلسطین میں سکونت اختیار کرلی۔ (۴) لغت انگریزی میں لفظ Phlist کے معنی سخت مزاج کے ہیں، شاید اسی معنی کی جانب رخ کرتے ہوئے ارض مقدس کا نام Phlistine بمعنی سخت مزاج والے رکھا گیا ہو، اور قرآن مجید کے قول (وإن فيها قوما جبّارين) کو بجا ثابت کیا گیا ہو۔[۴]

محل وقوع: فلسطین شام کے جنوبی مغربی حصے میں واقع ہے یہ برّاعظم ایشیا کے مغرب میں بحر ابیض متوسط کے ساحل پہ واقع ہے اس سرزمین کی حیثیت برّاعظم ایشیاء اور برّاعظم افریقہ کے درمیان ذریعۂ ارتباط کی ہے۔ سرزمین فلسطین کی جانب شمال میں لبنان، شمال مشرق کی جانب میں سیریا، جانب مشرق میں اردن اور اس کی جنوبی سرحدیں مصر سے جاملتی ہیں۔[۵]

رقبہ: ارض مقدس کا کل رقبہ ۲۷۰۰۹ مربع کیلو میٹر ہے جس کی مکمل تفصیل ذیل میں مذکور ہے:

شمال سے جنوب کی جانب اس کی لمبائی ۴۳۰ کیلو میٹر ہے جب کہ اس کی دوسری جانب کی لمبائی ۵۱ سے ۷۰ کیلو میٹر ہے اور تیسری جانب کی لمبائی ۷۲ سے ۹۰ نوے کیلو میٹر ہے اور چوتھی جانب کی لمبائی ۱۱۷ کیلو میٹر ہے۔ (۶)

ارضِ مقدس کا موسم:

سرزمین فلسطین بحیرۂ روم کی معتدل آب و ہوا کا حصہ ہے جو انسانی زندگی اور پیداوار کے لیے نہایت موزوں ہے۔ اس سرزمین کے ساحلی علاقے اور مغرب کے بلند علاقے بحر ابیض متوسط کے موسم کے مانند ہیں۔ ارض مقدس کے ریگستانی علاقے خوش ہوا والے ہیں جن میں سر فہرست نقب، وادی عربہ اور اردن وغیرہ ہیں۔ (۷)

بلادِ فلسطین: سرزمین فلسطین اگرچہ جغرافیائی رقبے کے اعتبار سے انتہائی چھوٹا علاقہ ہے لیکن آبادی کے اعتبار سے انتہائی گھنیرا ہے ۱۳۶۸ ہجری بمطابق ۱۹۴۸ عیسوی کے مطابق سرزمین فلسطین ۲۷ شہر اور ۹۳۵ دیہات و قصبات پر مشتمل تھی (۸)، جن میں قابل ذکر یہ ہیں:

شہر قدس: مذکورہ بالا شہر کو مختلف ناموں سے جانا جاتا ہے جیسے یروشلم اس نام سے یہودی و عیسائی شہر قدس کو پکارتے ہیں۔ جیبوس یہ شہر ہذا کا سب سے قدیم ترین نام ہے مذکورہ بالا شہر کے نام یروشلم کے سلسلے میں ارینالڈ اور ابوالڈ کا کہنا ہے کہ یہ دو عبرانی الفاظ یرو اور شیلم کا مرکب ہے جس کے معنی "ورثہ امن" ہے۔ یروشلم ہی کی وجہ تسمیہ کے بارے میں ایک دوسرے یورپین مؤرخ کا یہ کہنا ہے کہ یہ ایک شہر پہلے دو الگ الگ شہر تھے ایک کا نام جیبوس اور دوسرے کا نام سلم تھا جب یہ دونوں علیحدہ علیحدہ شہر مرکب ہوئے تو ان کا نام بھی مفرد سے مرکب یعنی جیبوس سلم ہو گیا، یہی نام بعد میں بگڑ کر یروشلم کہلانے لگا۔ مذکورہ بالا یروشلم کی وجوہ تسمیہ کے علاوہ اور بھی بہت سی وجوہات ہیں (۹)، لیکن طوالت مضمون سے گریز کرتے ہوئے یہیں پر اکتفا کر رہا ہوں۔

یہ شہر سرزمین فلسطین کے قلب میں سمندری سطح سے تقریباً ۷۲۰ سے ۸۳۰ میٹر اونچے ٹیلے پر شرقاً ۳۵ خط طول البلد اور شمالاً ۳۴ خط ارض البلد پہ واقع ہے۔

شہر قدس بحر ابیض متوسط سے تقریباً ۳۵ میل کے فاصلے پر مغرب میں، بحر مردار سے ۱۸ میل مشرق میں، نہر اردن سے تقریباً ۲۶ میل شمال میں، بحر احمر سے تقریباً ۲۵۰ کیلو میٹر جنوب میں واقع ہے۔ (۱۰)

یہ شہر مسلمان اور غیر مسلمان دونوں کے نزدیک بے انتہا اوصاف و خصائص کا حامل ہے۔ مسلمانوں کے نزدیک یہ دنیا کا تیسرا مقدس شہر ہے۔ سرزمین اسراء و معراج ارض قبلہ اولی جیسی اہم فضیلت بھی اسی شہر سے وابستہ ہیں۔ (۱۱)

شہر الخلیل: مذکورہ بالا شہر کا نام ابوالانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نام پر رکھا گیا ہے۔ یہ شہر سرزمین فلسطین کے جنوبی کنارے پہ واقع ہے یہ شہر بھی بہت سی خصوصیات و برکات کا مصداق ہے جس میں حضرت موسی حضرت یعقوب اور حضرت سارہ علیہم السلام کی قبور کا ہونا بھی شامل ہے مذکورہ بالا شہر کی کل آبادی تقریباً ایک لاکھ تیس ہزار ہے۔ (۱۲)

نابلس: مذکورہ بالا شہر سرزمین فلسطین میں واقع دو پہاڑ (جبل جریزم اور جبل عیبال) کے درمیان میں واقع ہے۔ اس شہر کو فاتح مصر حضرت عمر بن عاص رضی اللہ عنہ نے فتح کیا تھا اس شہر کی فضیلت میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اس کی خاک میں بڑے بڑے جلیل القدر علماء نے جنم لیا ہے جنہوں نے ایک عالم کو اپنے چشمۂ روحانی سے سیراب کیا ہے۔ جس میں مشہور حنبلی

فقیہ ابن قدامہ قدوسی رحمۃ اللہ علیہ، محدث وادیب علامہ سفارینی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

مذکورہ بالا شہر کے باشندوں میں جذبۂ جہاد ہونے کی وجہ سے اس شہر کو "کوہ آتش" بھی کہا جاتا ہے اس شہر کی کل آبادی تقریباً ایک لاکھ چالیس ہزار ہے۔[۱۳]

غزہ : اس شہر کو غزہ ہاشم بھی کہا جاتا ہے کیونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے جد اعلی ہاشم بن عبد مناف آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل وفات پاکر اسی شہر میں مدفون ہوئے تھے، اس شہر کی فضیلت میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ مشہور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ (محمد بن ادریس بن عباس بن عثمان بن شافعی رحمۃ اللہ علیہ) کی پیدائش اسی مقام محمود پر ہوئی تھی، انہوں نے اس سرزمین سے اپنی محبت کا اظہار زبان عربی میں یوں فرمایا ہے کہ:

وإني لمشتاق إلى أرض غزة

وإن خانني بعد التفرق كتماني

سقى الله أرضا لو ظفرت بتربها

كحلت بها من شدة الشوق أجفاني

یہ شہر فلسطین کے جنوب میں بحر ابیض متوسط کے ساحل پہ واقع ہے، شہر مذکور کی حیثیت خط فاصل کے مانند ہے؛ کیونکہ اس کا محل وقوع مصر و شمالی افریقہ کے مابین ہے۔ اس شہر کی ابادی تقریباً ۱۰ لاکھ سے متجاوز ہے۔[۱۴]

یافا: مذکورہ بالا شہر کو بحر احمر کی دلہن کہا جاتا ہے، "یافا" کنعانی لفظ "یافی" کا محرف ہے۔ مذکورہ بالا شہر کو صہیونیت کے خلاف جدوجہد اور فلسطین کے حق میں ہونے والی تحریکات کے لحاظ سے مرکز تصور کیا جاتا ہے۔[۱۵]

عکا: یہ شہر بحر ابیض متوسط کے ساحل پہ واقع ہے صحابی رسول حضرت شرجیل رضی اللہ عنہ نے اس کو فتح کیا تھا، اس شہر کو ایک بہت اہم فضیلت حاصل ہے اور وہ یہ ہے کہ کاتب وحی حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے اس شہر میں پہلی اسلامی بندرگاہ قائم کی تھی۔[۱۶]

ارض مقدس کی اہم تاریخی مساجد:

مسجد اقصیٰ: یہ مسلمان عالم کا قبلہ اولی ہے اور اس سے مسلمانوں کے بہت سے حقوق وابستہ ہیں[۱۷] یہ مسجد شہر قدس میں جبل موریا نامی ایک پہاڑی پہ واقع ہے اس کے مغربی حصے کی جانب کی لمبائی ۴۹۱ میٹر ہے، مشرقی حصے کی لمبائی ۴۶۲ میٹر ہے، شمالی حصے کی لمبائی ۳۱۰ میٹر ہے، جنوبی حصے کی لمبائی ۲۸۱ میٹر ہے چنانچہ مسجد اقصی کا کل رقبہ ۱۴۴۰۰۰ میٹر ہے۔[۱۸] اس مسجد کے اندر بہت سی تاریخی چیزیں ہیں جیسے قبہ سخرہ یہ اس مقام پر محیط ہے جہاں سے سفر معراج میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا سے آسمانوں کی طرف صعود ہوا تھا[۱۹]۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سے عناصر ہیں جن کا احاطہ اس مضمون میں قابل تحسین نہیں ہے۔

مسجد ابراہیمی: اس مسجد کی نسبت حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کی طرف کی گئی ہے یہ شہر خلیل کے وسط میں واقع ہے اس مسجد کی تاریخی باتوں میں سے ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ عہد مملوکی میں یہ دنیا کی سب سے بڑی مسجد تھی لیکن

افسوس صد افسوس! اب قوم یہود نے بہ زور تلوار اس پر قبضہ کر لیا ہے۔[۲۰]

مسجد جزار: یہ مسجد شہر عکا کی سب سے بڑی جامع مسجد ہے اس کی عمارت خلافت عثمانیہ کی تعمیرانہ فنکاری کا بہترین نمونہ ہے یہ سوق ابیض کے آخری سرے پہ واقع ہے اس کا نام اس کے بانی عثمانی قائد احمد پاشا جزار کے نام پر ہے۔[۲۱]

عظیم مسجد یافا: یہ مسجد شہر یافا کے بالکل وسط میں گھنٹہ گھر کے سامنے واقع ہے۔ یہ مسجد دو منزلہ ہے جس کے صحن میں تعلیم وتعلم کا نظام قائم ہے مسجد ہذا میں ایک کتب خانہ بھی ہے جس میں نادر ونایاب کتب دستیاب رہتی ہیں۔[۲۲]

مندرجہ بالا چار مساجد کے علاوہ اور بھی بہت سی مساجد جو سرزمین فلسطین میں واقع ہیں اور اہمیت کی حامل بھی ہیں؛ لیکن پھر بھی ان کے ذکر سے انحراف کیا گیا ہے تاکہ مضمون طوالت سے محفوظ رہے۔

سرزمین فلسطین کے اہم مقبرے: مقبرہ رحمت، مقبرہ یوسفیہ، مقبرہ باب الساہرہ، مقبرہ ام طوبی، مقبرہ جبل المبکر، مقبرہ طور، مقبرہ شرفات وغیرہ۔[۲۳]

مذکور بالا مقابر کے سوا اور بھی بہت سے قبرستان ہیں جن کی تفصیل سے اختصار کی طرف رجوع کرتے ہوئے گریز کیا گیا ہے، اسی وجہ سے جن کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے تو صرف ان کے نام ہی پر اکتفاء کر لی گئی ہے، تاکہ اختصار کے راستے میں تفصیل حائل نہ ہو۔

ارض مقدس کے اہم بازار:

سوق علون، سوق حصر، سوق لحامین، سوق نحاسین، سوق عطارین، سوق باشورہ، سوق صیاغ، سوق یہود، سوق باب سلسلہ، سوق قطانین، سوق باب الزیت، سوق باب عامود، سوق باب حطہ، سوق حارۂ نصاری۔[۲۴]

معمولات سابقہ کے مطابق بازار کے باب میں بھی غرض اختصار سے صرف اسماء ہی پر قلم روک لیا گیا ہے۔ بجائے اس کے کہ ان کی تفصیلات پر بھی کچھ روشنی ڈالی جاتی چنانچہ اگلا باب پیش خدمت ہے۔

سرزمین فلسطین بحیثیت دیار انبیاء کرام علیہم الصلاۃ والسلام:

سرزمین فلسطین کی اہمیت وافادیت اس وقت دوچند ہو جاتی ہے جب اس سرزمین پر بھیجے ہوئے انبیاء کرامؑ کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔ سرزمین فلسطین بیشتر انبیاء کرام علیہم الصلوۃ والسلام کی جائے بعثت یا جائے ہجرت رہا ہے جن میں ابوالانبیاء حضرت ابراہیم، حضرت لوط، حضرت اسحاق، حضرت یعقوب، حضرت موسی، حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہم الصلوۃ والسلام سر فہرست ہیں۔ نیز بنی اسرائیل کے تمام کے تمام انبیاء کرام علیہم الصلوۃ والسلام کا وطن اور جائے بعثت یہی سرزمین رہی ہے۔[۲۵]

سرزمین فلسطین بحیثیت مسکن صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین:

ارض مقدس جس طرح حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوۃ والسلام کے فیوض سے معمور ہوئی ہے اسی طرح حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے فیوض سے بھی معمور ہوئی ہے، جس طرح فلسطین انبیاء کرام علیہم الصلوۃ والسلام کی جائے بعثت یا ہجرت ہوا تھا اسی طرح حضرت صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین علیہم اجمعین کی جائے ہجرت یا سفر بھی ہوا ہے۔

چنانچہ آج ہم مسلمانوں کے لیے یہ امر نہایت دشوار کن ہے کی ان حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کا احاطہ کریں جو اس متبرک سرزمین پر پناہ گزیں ہوئے تھے۔ لیکن چند اسماء جو تاریخ میں محفوظ تھے وہ مذکور ہیں:

حضرت عبیدہ بن الجراح، ام المومنین حضرت صفیہ، حضرت معاذ بن جبل، حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت خالد بن ولید، حضرت ابوذر غفاری، حضرت ابو دردہ، حضرت سلمان فارسی، حضرت عمرو بن عاص، حضرت سعد بن زید، حضرت ابوہریرہ، حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہم اجمعین۔ (۲۶)

مذکورہ بالا اسمائے حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم میں بعض اسماء ان اصحاب رضوان اللہ علیہم اجمعین کے بھی ہیں جنہوں نے مستقل طور پر ارض مقدس کو اپنا وطن نہیں بنایا تھا۔

ارض فلسطین بحیثیت مدفن صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین:

جس طرح حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کا مسکن سرزمین فلسطین رہی ہے اسی طرح حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کا مدفن بھی سرزمین فلسطین رہی ہے۔ ذیل میں چند سرزمین مقدس میں مدفون صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے اسماء مذکور کیے جا رہے ہیں: حضرت عبادہ بن ثابت، حضرت ابوریحانہ، حضرت ابراہیم مقدسی، حضرت فیروز دیلمی، حضرت شداد بن اوس، حضرت ذوالاصابع تمیمی، حضرت مسعود بن اوس بن زید، حضرت وائلہ بن اسقع، حضرت یزید بن سلام، حضرت زیاد بن ابی سودہ رضوان اللہ علیہم اجمعین۔ (۲۷)

مذکورہ بالا دس اصحاب رضی اللہ عنہم اجمعین کے ماسوا اور بھی صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین جو سرزمین فلسطین میں مدفون ہیں لیکن ان کے اسماء بھی اختصار کی غرض سے حذف قرار دے کر یہیں پر فصل اول کا اختتام کر دیا گیا ہے۔

حوالہ جات

۱- صلیبی وصہیونی سازشیں اور مسجد اقصیٰ کی بازیابی صفحہ ۲۴ بیت المقدس اور مسئلۂ فلسطین صفحہ ۹
۲- بیت المقدس اور مسئلہ فلسطین صفحہ ۹
۳- بیت المقدس اور مسئلۂ فلسطین صفحہ ۹
۴- بیت المقدس اور مسئلۂ فلسطین صفحہ ۱۰
۵- بیت المقدس اور مسئلۂ فلسطین صفحہ ۸
۶- بیت المقدس اور مسئلۂ فلسطین صفحہ ۸، ۱۱
۷- صلیبی وصہیونی سازشیں اور مسجد اقصی کی بازیابی صفحہ ۲۶، ۲۵
۸- فلسطین کسی صلاح الدین ایوبی کے انتظار میں صفحہ ۵۱
۹- بیت المقدس کا مختصر تعارف تاریخ کے آئینہ میں صفحہ ۱۳، ۱۴
۱۰- فلسطین کسی صلاح الدین ایوبی کے انتظار میں صفحہ ۱۰۳، ۱۰۴
۱۱- بیت المقدس اور مسئلہ فلسطین صفحہ ۱۷، ۳۷
۱۲- فلسطین کسی صلاح الدین ایوبی کا انتظار میں صفحہ ۱۲
۱۳- فلسطین کے صلاح الدین ایوبی کا انتظار میں صفحہ ۵۲، ۵۳
۱۴- فلسطین کسی صلاح الدین ایوبی کا انتظار میں صفحہ ۵۳، ۵۴
۱۵- فلسطین کسی صلاح الدین ایوبی کے انتظار میں صفحہ ۵۴
۱۶- فلسطین کسی صلاح الدین ایوبی کا انتظار میں صفحہ ۵۴
۱۷- فلسطین کسی صلاح الدین ایوبی کے انتظار میں صفحہ ۵۴، صحیح البخاری حدیث: ۴۴۸۶
۱۸- فلسطین کسی صلاح الدین ایوبی کے انتظار میں صفحہ ۵۵، ۱۱۸، ۱۱۹

۱۹۔ فلسطین کسی صلاح الدین ایوبی کے انتظار میں صفحہ ۵۵، ۱۲۰، ۱۲۵
۲۰۔ فلسطین کسی صلاح الدین ایوبی کے انتظار میں صفحہ ۵۵
۲۱۔ فلسطین کسی صلاح الدین ایوبی کے انتظار میں صفحہ ۵۵
۲۲۔ فلسطین کسی صلاح الدین ایوبی کے انتظار میں صفحہ ۵۵، ۵۶
۲۳۔ صلیبی وصہیونی سازشیں اور مسجد اقصی کی بازیابی صفحہ ۲۸
۲۴۔ صلیبی وصہیونی سازشیں اور مسجد اقصی کی بازیابی صفحہ ۲۸
۲۵۔ فلسطین کسی صلاح الدین ایوبی کے انتظار میں صفحہ ۱۰۳، بیت المقدس ایک تہذیبی کشمکش صفحہ ۳۵، ۳۶، ۳۸، ۳۹، صلیبی و صہیونی سازشیں اور مسجد اقصی کی بازیابی صفحہ ۲۶، ۲۷
۲۶۔ فلسطین کسی صلاح الدین ایوبی کے انتظار میں صفحہ ۱۰۲
۲۷۔ صلیبی وصہیونی سازشیں اور مسجد اقصی کی بازیابی صفحہ ۲۷

فصل ثانی

ارض مقدس سے وابستہ
مسلمانوں کے دینی، شرعی اور تاریخی حقوق

ارض مقدس میں قبلۂ اولی ہونا:

یہ امر نہایت ہی اہم ترین؛ بلکہ یوں اگر کہا جائے تو غلو نہیں ہوگا کہ مسلمانانِ عالم کا سب سے بڑا حق ارضِ فلسطین پر یہی ہے کہ اس سر زمین پر تمام مسلمانوں کا قبلہ اولی ہے، جو مسجد اقصیٰ کے نام سے موسوم ہے، اگر یہ فضیلت ارضِ فلسطین کے فضائل سے جدا کر دی گئی تو اس کے فضائل میں کمی ہی نہیں؛ بلکہ ویرانی چھا جائے گی، جس کا تعلق ہمارے دین سے بھی وابستہ ہے اور ہماری شریعت و تاریخ سے بھی۔ سر زمینِ فلسطین میں واقع مسجد اقصیٰ کے قبلۂ اولی ہونے کی شہادت حضرت براء ابن عازب رضی اللہ عنہ کی یہ روایت دیتی ہے: "أن رسول الله صلى الله عليه وسلم صلى إلى بيت المقدس ستة عشر شهرا أو سبعة عشر شهرا"۔ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سولہ یا سترہ مہینے تک بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز ادا کی)۔[1]

سر زمین فلسطین میں تیسرا مقدس شہر ہونا:

جہاں ایک طرف سر زمین فلسطین کے لیے ایک اعجاز ہے کہ اس کی گود میں مسلمانانِ عالم کے لیے قبلہ اولی واقع جو مسجد اقصیٰ کے نام سے جانا جاتا ہے، وہیں ایک اس کے لیے قابلِ فخر بعد بھی یہ ہے کہ اس کی سر زمین میں ایک ایسا شہر بھی واقع ہے، جس کا مقام مذہب اسلام میں عالم دنیا کا تیسرا مقدس مقام ہونا ہے۔ شہر موصوف شہر قدس سے موسوم ہے، جس کے بارے میں نبی علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ عبادت کی نیت سے سفر صرف تین مساجد کی جانب کیا جا سکتا ہے۔ مسجد حرام مسجد اقصی اور میری مسجد (مسجدِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم)۔

مذکورہ بالا حدیث شریف سے اس بات کا علم ہو رہا ہے کہ تین مساجد مذہب اسلام میں دوسری مساجد کے مقابلے میں فضائل و مناقب میں ابتر و برتر ہیں؛ لیکن عظیم عربی مصنف مصطفی محمد الطحان نے مذکورہ بالا حدیث کی روشنی میں یہ قلم بند فرمایا ہے کہ مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ اور مدینہ قدس دنیا میں تین ایسے مقامات ہیں جو سب سے مقدس و محترم ہیں۔[2]

چنانچہ فلسطین تقدیساتِ اسلام میں سے ہے تو مسلمانانِ عالم کا سرزمینِ فلسطین میں دینی و شرعی حق ہے؛ کیونکہ مذاہب کے مقدسات میں اہل مذاہب کا حق شامل ہوتا ہے۔

سرزمین فلسطین کا ارض خیر و برکت ہونا:

کلام مبین میں اللہ تبارک و تعالی نے فعل 'بارکنا' کو پانچ مرتبہ استعمال فرمایا ہے۔ اور پانچوں مرتبہ اس فعل سے سرزمین فلسطین ہی کو تعبیر فرمایا ہے۔ (۳)

سب سے پہلے سورۃ بنی اسرائیل میں نبیؐ کا تذکرہ معراج کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے کہ پاک ہے وہ ذات جو اپنے بندے کو رات ہی میں مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک لے گئی، جس کے آس پاس ہم نے برکت رکھی ہے۔ (۴) دوسری مرتبہ حضرت لوطؑ کی قوم کے عذاب سے ہلاک ہونے اور ان کے عذاب سے محفوظ رہنے کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اور ہم لوطؑ کو بچا کر اس زمین کی طرف لے گئے، جس میں ہم نے تمام جہاں والوں کے لیے برکت رکھی ہے۔ (۵) تیسری مرتبہ فرعون اور اس کے ساتھیوں کے غرق ہونے اور حضرت موسیٰ اور ان کے ساتھیوں کے سمندر پار کرنے کے بعد کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اور ہم نے ان لوگوں کو جن کو کمزور بنا رکھا گیا تھا، مشرق و مغرب کے ان علاقوں کا وارث بنادیا جن میں ہم نے برکت رکھی ہے۔ (۶) چوتھی مرتبہ حضرت سلیمانؑ کی ہواؤں پر حکومت کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اور ہم نے تند و تیز ہوا کو سلیمانؑ کے تابع کر دیا جو ان کے فرمان کے مطابق اس زمین کی طرف چلا دی تھی، جہاں ہم نے برکت دے رکھی تھی۔ (۷) پانچویں مرتبہ اللہ جل شانہ اہل سبا پر کیے گئے اپنے انعامات و احسان کو گناتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اور ہم نے ان کے اور ان کی بستیوں کے درمیان جن میں ہم نے برکت دے رکھی تھی چند بستیاں اور رکھی تھی جو بر سر راہ ظاہر تھیں۔ (۸)

مذکورہ بالا پانچوں آیات کے مفاہیم ہمیں اس بات کی اطلاع دے رہے ہیں کہ سرزمین فلسطین دینی، شرعی اور تاریخی اہمیت سے وابستہ ہے۔ جن کا تعلق دینِ اسلام سے ہے، اسی اعتبار سے سرزمینِ فلسطین سے مسلمانوں کا دینی، شرعی اور تاریخی حق ثابت ہوا۔

سرزمین فلسطین کا ارض اسراء و معراج ہونا:

مذہب اسلام میں واقعہ معراج کی بہت بڑی اہمیت و فضیلت ہے، کیونکہ نماز شریعت میں ایک اہم اور بنیادی جز ہے، جس کی فرضیت واقعہ ہذا ہی میں ہوئی۔ اسی طرح نبی ﷺ کا تمام انبیاء کو نماز پڑھانا اور ان کا امام بننا یہ عمل بھی اسی سفر میں انجام دیا گیا، اسی کی مناسبت سے آپ ﷺ کو امام الانبیاء کا خطاب ملا، اور بھی اس سے متعلق فضائل ہیں جس کی وجہ سے مسلمانوں کے دلوں میں واقعۂ معراج کی بڑی قدر و منزلت ہے۔ اگرچہ اس سفر کی ابتداء مسجد حرام سے ہوئی تھی؛ لیکن آسمانوں کی طرف صعود کی شروعات اور تمام انبیاء علیہم السلام کی امامت کرنا، اسی سرزمین پر ہوا تھا۔ اسی مناسبت سے ارض فلسطین کو ارض اسراء و معراج کہا جاتا ہے (۹)، واقعہ ہذا کا تعلق جہاں ایک طرف دین و شریعت سے ہے تو وہیں دوسری جانب تاریخ سے بھی ہے؛ چنانچہ سرزمینِ فلسطین سے مسلمانوں کے دینی، شرعی اور تاریخی حقوق وابستہ ہیں۔

سر زمین فلسطین کا مرکز اسلام ہونا:

صحابی رسول ﷺ حضرت سلمہ بن نفیلؓ سے مروی ہے کہ اسلام کا مرکز شام کا علاقہ ہے۔ عبد اللہ ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ میں نے اپنے تکیے کے نیچے سے نکل کر ایک مصحف کو نور کی شکل میں ارضِ شام کی طرف جاتے ہوئے دیکھا تو جان لو کی جب شام کا علاقہ فتنوں سے دوچار ہو جائے گا تو ایمان کی یہ روشنی وہاں باقی رہے گی(۱۰)۔ مذکورہ بالا پہلی روایت سے فلسطین اور علاقہ شام کے مرکزیت کی صراحت مل رہی ہے، جس کا تعلق جز سے نہیں؛ بلکہ کل سے ہوتا ہے؛ چنانچہ ارضِ فلسطین کے مذہب اسلام سے مکمل تعلق کے سبب سے ارض فلسطین سے مسلمانوں کے دینی، شرعی اور تاریخی حقوق وابستہ ہیں۔

سر زمین فلسطین کا ارض شہداء وارض جہاد ہونا:

حضرت امام احمدؒ نے حضرت ابو امامہؓ سے ایک مرفوع روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا میری امت میں سے ایک گروہ اس سر زمین میں غلبہ حق کے لیے برابر اپنے دشمنوں کے ساتھ بر سر پیکار رہے گا، یہاں تک کہ قیامت آ جائے گی اور وہ اسی طرح جہاد کرتے رہیں گے۔(۱۱) نبی علیہ السلام کا یہ فرمان بجا ثابت ہوا اور بحمد اللہ تبارک و تعالیٰ سر زمینِ فلسطین کو برابر ایسے افراد ملتے رہے، جو سر زمینِ فلسطین کے تحفظ میں اپنا سب کچھ قربان کرتے رہے۔ اور آج بھی الحمد للہ ایک گروہ اس کے تحفظ میں سر گرم عمل ہے احادیث نبوی ﷺ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سر زمین ہمیشہ معرکہ آرائیوں کی آماجگاہ بنی رہے گی اور یہاں آباد مسلمانوں کو مجاہد کا مقام حاصل ہوگا۔(۱۲)

مذکورہ باب میں ذکر کی گئی احادیث مبارکہ سے اس بات کا علم ہو رہا ہے کہ سر زمینِ فلسطین کی حیثیت مذہبِ اسلام میں چھاونی کے مانند ہے، جس کے تحفظ سے اسلام و مسلمان کا تحفظ وابستہ ہے۔ لہٰذا سر زمینِ فلسطین سے مسلمانوں کے دینی، شرعی و تاریخی حقوق وابستہ ہیں اس کے بحیثیت صدر ہونے کے۔

سر زمین فلسطین کا مسکن انبیاء ہونا:

سر زمین فلسطین کی اہمیت وافادیت تاریخ کے ہر دور میں رہی ہے، یہی نہیں؛ بلکہ انسان کے ہر طبقے میں رہی ہے، یہاں تک کہ حضرات انبیاءؑ میں بھی اس ارض مقدس کی تقدیس و تحریم نظر آتی ہے اس کی جانب شدر حال کے سبب سے۔

ابو الانبیاء حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ الصلاۃ والسلام جب تمام امتحانات کا سامنا کر چکے اور اپنی قوم پر اپنی دعوت کا کچھ اثر نہ دیکھا؛ بلکہ اپنی ذلت و رسوائی ہی کو دیکھتے رہے، کبھی آگ میں ڈالے جانے کا سامنا کیا، تو کبھی کچھ، کبھی کچھ۔ آخر کار حضرت سیدنا ابراہیم اور حضرت سارہ علیہا السلام نے ہجرت کا ارادہ کیا جس کے لیے سر زمینِ فلسطین کو منتخب فرمایا۔ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے ساتھ حضرت لوطؑ کو بھی لیا، جو اپنی قوم کے نبی؛ مگر حضرت ابراہیمؑ کی شریعت کے تابع تھے، ان کے ساتھ بھی وہی حالات پیش آئے جن کا مشاہدہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کر چکے تھے ان کی قوم نے بھی انہیں جھٹلایا اور ستایا تھا۔(۱۳) چنانچہ اللہ رب العزت کے ان دو عظیم پیغمبروں نے اپنی اپنی رفیق حیات کے ساتھ اسی سر زمین پر دعوت الی اللہ کا کام شروع کر دیا، یہاں تک کہ پیغام اجل آ پہنچا۔

حضرت ابراہیمؑ کے چھوٹے بیٹے حضرت اسحاقؑ کی ولادت بھی اسی مقدس شہر میں ہوئی اور انہوں نے اپنی پوری زندگی اسی سرزمین پر دعوت و تبلیغ کرتے ہوئے گزاری؛ یہاں تک کہ اپنی آخری سانس بھی اسی مقدس مقام پر لی۔ (۱۴)

حضرت یعقوبؑ جو کہ نبی ہونے کے ساتھ ساتھ نبی (حضرت اسحاق علیہ السلام) کے بیٹے اور نبی (حضرت ابراہیمؑ) کے پوتے بھی ان کا دوسرا نام اسرائیل بھی تھا، جس کی جانب یہودیوں نے نسبت کرتے ہوئے، اپنی قوم کا نام اسرائیلی اور اپنے وطن کا نام اسرائیل رکھا۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کی بھی جائے پیدائش فلسطین ہی تھی اور مزید یہ کہ انھوں نے اپنی حیاتِ مبارکہ کے اکثر ایام بھی یہیں گزارے اور اپنے روحانی فیض سے عوام الناس کو سیراب کرتے رہے، اور مختلف قسم کی تکالیف برداشت کرتے رہے، پھر اپنے لاڈلے بیٹے حضرت یوسف علیہ السلام کے مصر کا بادشاہ بننے کے بعد انھوں نے اپنے وطن قدیم کو الوداع کہا اور بلادِ مصر کو اپنا وطن بنالیا۔ (۱۵)

حضرت شعیبؑ جو کہ حضرت ابراہیمؑ سے نسبی تعلق رکھنے کے ساتھ ساتھ حضرت موسیٰؑ کے سسر بھی ہیں، ان کا بھی وطن اصلی شام کا علاقہ ہے؛ لیکن ان کی وفات اردن میں ہوئی، جس سے اس بات کا اشارہ مل رہا ہے کہ حضرت شعیبؑ نے اپنا وطن تبدیل فرمالیا تھا۔ (۱۶) واللہ اعلم۔

حضرت موسیٰؑ جن کا وطن اصلی تو مصر تھا؛ لیکن جب انھوں نے دھوکے سے قبطی کا قتل کردیا تو وہ چھپ چھپا کر مدین چلے گئے وہاں ان کی شادی ہوئی، حضرت شعیبؑ کی بیٹی کے ساتھ اس کے بعد انھوں نے اللہ تعالی کے حکم کے مطابق فرعون کو دعوت دینے کے لیے اپنے وطن مصر تشریف لائے، اور اہل مصر میں دعوت الی اللہ کا کام شروع کردیا تو فرعون اور اہل مصر سب کے سب ان کے دشمن ہوگئے اور موسیٰؑ اپنا وطن چھوڑنے پر مجبور ہوگئے، تو جب حضرت موسیٰؑ نے وطن کو چھوڑ کر دوسری جگہ جانے لگے تو فرعون نے بھی ان کا پیچھا کیا؛ یہاں تک کہ حضرت موسیٰؑ ایک سمندر کے پاس پہنچے جہاں آگے سمندر تھا اور پیچھے لشکر فرعون تو موسیٰؑ نے اپنے عصا کو سمندر پر مارا تو سمندر میں ۱۲ راستے رونما ہوگئے اور حضرت موسیٰؑ اور ان کا لشکر مطمئنین آمین کے مثل پار ہوگیا اور سرزمین فلسطین میں داخل ہوگیا، اور فرعون غرق ہوگیا۔ (۱۷)

حضرت داؤد علیہ السلام بارہویں صدی قبل مسیح میں یوشع بن نون علیہ السلام کی قیادت میں فلسطین میں داخل ہوئے اور کنعانی اور فلسطینیوں کے ساتھ انہوں نے جنگ کی اور انہوں نے قبلہ اولی کی بنیاد رکھی لیکن افسوس وہ ان کی زندگی میں پایہ تکمیل کو نہیں پہنچ سکی۔ (۱۸)

حضرت سلیمان علیہ السلام کا بھی مسکن یہی فلسطین ہی تھا انہوں نے اپنے دور حکومت میں قبلہ اولی کی تعمیر مکمل کرائی اور خداداد ایک زبردست حکومت کی پوری دنیا پر، جس کی نظیر کمیاب نہیں نایاب ہے۔ (۱۹)

اسی طرح حضرت یونس علیہ السلام کا بھی وطن فلسطین ہونا ثابت ہوتا ہے آپ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ آپ ناصرہ میں پیدا ہوئے اور حلول میں دفن ہیں۔ (۲۰)

اسی طرح حضرت عیسی علیہ السلام کا مسکن ارض مقدس ہونا ثابت ہے کہ آپ بیت لحم میں پیدا ہوئے اور ناصرہ میں

پرورش اور وہیں دعوت و تبلیغ کا کام کیا۔[۲۱]

مذکورہ بالا گیارہ انبیاء کرام علیہم الصلاۃ والسلام کا وطن فلسطین ہونا اس کے ماسوا تمام بنی اسرائیلی انبیاء کرامؑ کا وطن فلسطین ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ اس سرزمین کا اصل مذہب اسلام ہے اور اس کو فروغ دینے والے مسلمان ہیں۔ چنانچہ اس سرزمین سے مسلمانانِ عالم کا دینی شرعی اور تاریخی حق وابستہ ہے۔

سرزمین فلسطین کا مسکن صحابہ ہونا:

جس طرح ارض مقدس انبیاء علیہم السلام کا مسکن رہا ہے، اسی طرح حضرات صحابہ میں سے بھی بہت سے ایسے ہیں، جنھوں نے اپنا رخت سفر اس جانب باندھا تھا جن میں سے بعض تو مستقل طور پر وہاں مقیم ہو گئے تھے، بعض زیارت کرنے کے بعد اپنے وطن اصلی کی طرف روانہ ہو گئے تھے، جن کا اجمالی ذکر اسی مضمون کی فصل اوّل میں ارضِ مقدس کے مختصر تعارف کے ذیل میں کیا جا چکا ہے۔ لہذا اب یہاں اس کی کوئی حاجت نہیں ہے، صرف اتنی بات کافی ہو گی جس سے مسلمانانِ عالم کے ارضِ مقدس سے حقوق وابستہ ہو جائیں اس لیے کہ یہ فصل ارض مقدس سے وابستہ ہونے والے مسلمانوں کے دینی، شرعی اور تاریخی حقوق پر مبنی ہے۔

صحابہ کرام نے سرزمین فلسطین کو اپنا وطن بنایا ہے۔ لہذا سرزمینِ فلسطین کو اپنا وطن بنائے بغیر امت مسلمہ کے لیے صحابہ کرام کے طرزِ زندگی کو اسوۂ نمونہ عملی طور پر ثابت کرنا ممکن ہو گا؛ چنانچہ صحابہ کرامؓ کے طرز زندگی کو عملی طور سے اسوۂ و نمونہ بنانے کے لیے فلسطین سے مسلمانوں کا دینی، شرعی اور تاریخی حق وابستہ ہے۔

ارض مقدس پر حکومت اسلامی کا ہونا:

۱۵/ہجری مطابق ۶۳۶ء حضرت ابو بکر صدیقؓ کے انتقال کے بعد حضرت عمر بن خطابؓ نے خلافت سنبھالی اور حضرت خالد بن ولید اور حضرت ابو عبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہم نے ان کی سرپرستی میں فلسطین کو فتح کیا اور یہ ہدایت کی حضرت فاروق اعظم نے، کہ اب مقدس شہر میں کوئی یہودی آباد نہ ہو گا[۲۲]، اس کے بعد سے مسلسل ۱۹۴۸ء تک ۱۲۰۰ سال سرزمین فلسطین پر حکومت اسلامی رہی۔ درمیان کے ۹۱/ سال صلیبی جنگ کے اس سے مستثنیٰ ہیں، جب فلسطین ایک بار پھر یہود کے زیر تسلط ہو گیا تھا تب حضرت سلطان صلاح الدینؒ نے یہودیوں سے جنگ کر کے اس کو فتح کیا تھا[۲۳]، یہ دونوں فتوحات ہمیں بتا رہے ہیں کہ مسلمانوں نے جنگ کے ذریعے سے ارض مقدس کو اپنے زیر نگیں کیا ہے، جس کے ذریعہ سے فاتح فتحیاب ملک کا مالک بن جاتا ہے اور اس کو اپنے اختیارات حاصل ہو جاتے ہیں، اسی قاعدے کے اعتبار سے ارض مقدس پر مسلمانوں کے تاریخی حقوق وابستہ ہیں۔

حوالہ جات

۱- بیت المقدس اور مسئلہ فلسطین صفحہ ۱۷، صحیح البخاری حدیث ۴۴۸۶، بیت المقدس کا مختصر تعارف تاریخ کے آئینہ میں صفحہ ۷

۲- بیت المقدس ایک تہذیبی کشمکش صفحہ ۳۶، ۳۷، صحیح البخاری حدیث ۱۱۸۹

۳- بیت المقدس ایک تہذیبی کشمکش صفحہ ۳۴،۳۵

۴- معارف القران الاسراء آیۃ: ۱

۵- معارف القران الانبیاء آیۃ: ۱۷۱

۶- معارف القران الاعراف: ۱۳۷

۷- معارف القران الانبیاء: ۸۱

۸- معارف القران سبا: ۱۹

۹- بیت المقدس ایک تہذیبی کشمکش صفحہ ۳۷،۳۸

۱۰- بیت المقدس ایک تہذیبی کشمکش صفحہ ۳۸،۳۹

۱۱- بیت المقدس ایک تہذیبی کشمکش صفحہ ۳۸،۳۹

۱۲- بیت المقدس ایک تہذیبی کشمکش صفحہ ۳۸

۱۳- آسان ترجمہ قرآن صفحہ ۱۲۰۷، العنکبوت ۲۶

۱۴- آسان ترجمہ قرآن العنکبوت ۲۷

۱۵- قصص النبیین جلد سوم

۱۶- معارف القران پارہ ۸ صفحہ ۲۱۱، ۲۱۲

۱۷- معارف القرآن پارہ ۹ صفحہ ۵۲، ۵۳

۱۸- بیت المقدس اور مسئلہ فلسطین صفحہ ۳۲

۱۹- بیت المقدس اور مسئلہ فلسطین صفحہ ۳۲، بیت المقدس کا مختصر تعارف تاریخ کے آئینہ میں صفحہ ۱۲

۲۰- صلیبی و صہیونی سازشیں اور مسجد اقصی کی بازیابی صفحہ ۲۷

۲۱- صلیبی و صہیونی سازشیں اور مسجد اقصی کی بازیابی ص: ۲۷

۲۲- فلسطین کسی صلاح الدین ایوبی کے انتظار میں صفحہ ۷۹، ۱۰۵

۲۳- فلسطین کسی صلاح الدین ایوبی کے انتظار میں صفحہ ۱۰۹

فصل ثالث

خاتمہ مع فہرست مراجع ومصادر

خاتمہ: یہ وہ چند دینی، شرعی اور تاریخی حقائق ہیں جن کے سبب سے ارضِ فلسطین مسلمانوں کی تھی، مسلمانوں کی ہے اور مسلمانوں کی رہے گی۔ اگرچہ اقوام متحدہ کے ذریعے سے مسلمانوں کا اس سے حق منسوخ قرار دیا جائے، اس لیے کہ اقوام متحدہ کا تعلق قوانین سے ہے اور قوانین کے ذریعہ سے دین، شریعت اور تاریخ کا بدلنا محال ہے؛ چنانچہ مسلمانوں کا اس سے حق وابستہ تھا، وابستہ ہے اور وابستہ رہے گا۔ لہٰذا مسلمانوں پر اس کے حصول کے لیے ہر وقت تیار رہنا لازم وضروری ہے۔

ہم خون کی قسطیں تو کئی دے چکے لیکن
اے خاک وطن قرض ادا کیوں نہیں ہوتا

فہرست مراجع ومصادر

۱- القرآن الحکیم

۲- صحیح البخاری، محمد بن اسماعیل البخاریؒ

۳- معارف القرآن، مفتی محمد شفیع عثمانیؒ

۴- آسان ترجمہ قرآن، مفتی محمد تقی عثمانی

۵- فلسطین کسی صلاح الدین ایوبی کے انتظار میں، مولانا نور عالم خلیل الامینیؒ

۶- بیت المقدس ایک تہذیبی کشمکش، مصطفی محمد الطحان

۷- بیت المقدس کا مختصر تعارف تاریخ کے آئینہ میں، مفتی محمد سرور فاروقی ندوی

۸- صہیونیت اور اسرائیل کا تاریخی پس منظر، علامہ زاہد الراشدی

۹- صلیبی و صہیونی سازشیں اور مسجد اقصیٰ کی بازیابی، تبریز بخاری ندوی

۱۰- بیت المقدس اور مسئلۂ فلسطین، فتحیٰ عبد القادر

۱۱- قصص النبیین (جلد سوم) مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ

☆☆☆

تاریخ کے جھروکوں سے

دارالمصنفین کی علمی خدمات-ایک تعارف

عماراحمد ندوی
مدرسۃ العلوم الاسلامیہ، علی گڑھ

(نوٹ: آج سے ۸؍برس قبل مدرسۃ العلوم الاسلامیہ، علی گڑھ میں یوپی بھر میں پھیلے ندوہ کے ملحقہ مدارس کے درمیان مسابقہ منعقد ہوا تھا، اسی مسابقہ میں شرکت کے لیے راقم نے یہ مقالہ لکھا تھا اور الحمد للہ دوسرا انعام حاصل کیا تھا، خوش نصیبی ہے کہ امسال اسی ادارہ میں تدریس کے لیے آگئے۔ اب اسی مقالہ سے اپنے قلمی سفر کا آغاز کر رہے ہیں۔ طالبِ علمانہ مقالہ پیشِ خدمت ہے۔ عمار)

انیسویں صدی کے اواخر میں ہندوستان پر مغربی یلغار نے جو اثر ڈالا اس سے افکار وخیالات علوم و نظریات یہاں تک کی زندگی کا کوئی شعبہ محفوظ نہ رہ سکا تھا، لوگوں نے دین ومذہب، علوم وعقائد کو عقل کے ترازو پر تولنا شروع کر دیا تھا، جدید علوم وفنون نے اپنا دائرہ اتنا وسیع وکشادہ کر دیا تھا کہ جدید تعلیم یافتہ لوگ اپنے قدیم علمی اندوختے سے بیزار و محروم ہونے لگے تھے، اسلاف کے گراں قدر سرمایہ تہذیب اور ثقافتی ورثہ سے نابلد ونا آشنا ہو گئے تھے، قدیم علماء کو جدید حالات کا سرے سے علم ہی نہیں تھا، وہ پرانی درسیات کی کتابوں کی شروحات وغیرہ میں مصروف تھے، ایسے حالات میں جن عاقبت اندیش ودور اندیش شخصیات نے حالات کی سنگینیوں اور تبدیلیوں کو بھانپا اور ان کی ضرورتوں کو محسوس کیا ان میں پیش پیش سر سید احمد خاں اور ان کے رفقاء مولانا حالی مولانا شبلی مولوی چراغ علی اور ڈپٹی نظیر احمد ہیں، جنہوں نے اپنے علمی مضامین اور تصانیف سے جدید تعلیم یافتہ لوگوں میں سنجیدہ علمی ذوق تو پیدا کر دیا تھا؛ لیکن ان شخصیات میں علامہ شبلی کے علاوہ تمام لوگ مغربی تہذیب سے اس قدر مرعوب تھے کی وہ اپنی اسلامی تہذیب کو بھی مغربی تہذیب کے سانچے میں ڈھال دینا چاہتے تھے، لیکن علامہ شبلی کا مطمح نظر اور مقصد یہ تھا کہ اسلامی عقائد اسلامی، تاریخ اور اسلامی تہذیب کو زندہ وبرقرار رکھتے ہوئے جدید طرز اور عصری تقاضوں کے مطابق پیش کیا جائے، اس اعتبار سے علامہ اپنے تمام معاصرین ورفقا میں خواہ وہ قدیم علماء ہوں یا جدید تعلیم یافتہ لوگ فائق ممتاز نظر آتے ہیں۔

علامہ شبلی کو اس بات کا اچھی طرح علم تھا کہ مغربی قوتیں اور اسلام مخالف طاقتیں جو متون و بیانیے تیار کر رہی ہیں، اس میں ہماری اسلامی تہذیب و ثقافت، غیرت و حمیت، تعصب کی شکار ہو جائے گی اور اسلامی تاریخ پر پردہ ڈال دیا جائے گا، سامراجی کلامیہ مکمل طور پر مسلمانوں کے علوم وفنون کو ضائع کر دے گا، اس لیے علامہ نے دارالمصنفین کی شکل میں ایک جوابی کلامیہ کی ضرورت شدت سے محسوس کی اور اس وقت کے ایسے علماء و دانشوران سے رابطہ کیا جو مغربی چیلنجز اور ان کے اعتراضات کا مسکت جواب دے سکیں، کیونکہ علامہ شبلی بخوبی اس بات سے واقف تھے کہ تاریخ میں اہل قلم ہی ملکی حالات و خیالات میں انقلاب پیدا کر سکتے ہیں اور اسلامی تہذیب وثقافت سے روشناس کرا سکتے ہیں، اسلاف کے علمی اندوختوں سے باخبر کرا سکتے ہیں۔ علامہ شبلی کے ذہن میں دارالمصنفین کا خیال قیاسی طور پر آیا، ان کے نزدیک اس دور کی مثال عہد عباسی جیسی تھی،

اس دور میں بھی فلسفہ نے ایک نیا قالب اختیار کر لیا تھا، منطق میں نئے برگ و بار پیدا ہو گئے تھے، معانی و بلاغت کا اسلوب بدل گیا تھا، تاریخ ایک قسم کا فلسفہ بن چکی تھی، اسلامی علوم وآداب، خاص طور سے علوم دینیہ میں سینکڑوں قسم کے جدید ابواب پیدا ہو گئے تھے، اسی مثال کو اپنے سامنے رکھ کر علامہ قدیم علوم وآداب کو نئے طرز میں مرتب کرنے اٹھے اور ایک وسیع کتب خانہ قائم کرنے کا فیصلہ کیا، تاکہ مصنفین کو تصنیفی ضروریات و مطالعے کے لیے افادہ کا موقع مل سکے، اسی طرح تجارتی مکتبہ کا نظام خوش اسلوبی سے قائم کر کے مصنفین کو اشاعت وغیرہ کی دشواریوں سے محفوظ رکھا جا سکے۔

علامہ نے دارالمصنفین کے خیال کا اظہار ندوۃ العلماء کے ایک اجلاس میں دارالعلوم کی سہ سالہ رپورٹ پیش کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ قومی مذہبی ضروریات میں جس قدر قومی مدرسہ، ایک قومی کالج اور ایک یونیورسٹی کی ضرورت ہے، اسی قدر ایک قومی کتب خانہ اعظم کی بھی ضرورت ہے، اگر مسلمانوں کے مذہب مسلمانوں کے علوم اور مسلمانوں کی قومی تاریخ کو زندہ رکھنا ہے، تو ضروری ہے کہ ایک ایسا کتب خانہ قائم کیا جائے جس میں علوم مذہبی کے متعلق نادر و نایاب بیش بہا تصانیف موجود ہوں، جس میں مسلمانوں کے خاص ایجاد کردہ علوم و فنون کا کافی سرمایہ ہو، وہ تمام کتابیں جو اس فن کے دورِ ترقی کی مدارج ہوں، جس میں قدماء کے عہد کی یادگاریں ہوں اور ان سب باتوں کے ساتھ یہ کتب خانہ کسی کا ذاتی نہ ہو، بلکہ وقف عام ہو تاکہ تمام ہندوستان کے تمام مسلمان اور بالخصوص مصنفین اور اہل قلم اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔ بالاخر دارالمصنفین کی راہ کچھ اس طرح ہموار ہوئی کہ علامہ نے اپنا باغ اور اپنا بنگلہ وقف کر کے ساری رکاوٹیں ہی دور کر دیں اور ۲۱؍ نومبر کو اخوان الصفا کی ایک عارضی مجلس تشکیل دی گئی، جس کے ارکان میں مولانا حمید الدین فراہی، مولانا مسعود علی ندوی، سید سلیمان ندوی اور عبدالسلام ندوی جیسی شخصیات موجود تھیں۔ اس مجلس کی کوششوں سے ۲۵؍ مئی ۱۹۱۵ء کو دارالمصنفین ادارے کو باقاعدہ رجسٹر کیا گیا۔ علامہ نے دارالمصنفین کے جو مقاصد تحریر کیے تھے، وہ یہ کہ ملک میں اعلیٰ مصنفین اور اہل قلم کی جماعت پیدا کرنا، بلند پایہ کتابوں کی تصنیف وتالیف و ترجمہ، تصنیف شدہ کتابوں اور دیگر علمی وادبی کتابوں کی طباعت واشاعت کا سامان فراہم کرنا۔

آج دارالمصنفین کو قائم ہوئے ایک صدی گزر گزر چکی ہے۔ ہندوستان میں یہ ادارہ کسی تعارف کا محتاج نہیں اور کسی سے مخفی نہیں ہے کہ اس نے علمی سطح پر جو کارنامے انجام دیے ہیں، وہ قابل رشک ہیں۔ اس نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ مسلمان صرف قدامت پسند و دقیانوس نہیں ہے، بلکہ جہانوں کی جستجو کر سکتے ہیں، علم کی نئی دنیا آباد کر سکتے ہیں، زمانے کو نیا اور اچھوتا طرزِ تعلیم دے سکتے ہیں، سب سے پہلے تو خود علامہ ہی نے اپنی تحریروں سے مغرب کی غلط بیانیوں کے سد باب کی کوشش کی اور ان تعصبات کے تارے عنکبوت کو توڑا جو مستشرقین اور معاندین کے دماغ سے جمہور عوام کے ذہنوں تک پہنچ رہے تھے، اورنگزیب عالمگیر پر ایک نظر، حقوق الذمین، کتب خانہ اسکندریہ، یہ سب جوابی کلامیہ تھے علامہ شبلی کو اپنے اس مشن میں کافی حد تک کامیابی حاصل ہوئی، مزید برآں دارالمصنفین سے ایسے ارباب علم وہنر وابستہ ہوئے جن کے علم صلاحیت و مطالعاتی وسعت اور دور اندیشی پر کسی کو کوئی شک وشبہ نہیں ہو سکتا تھا، یہ وہ لوگ تھے جو اپنے فن میں نمایاں اور اعلیٰ علمی و تحقیقی ذہن رکھنے والے تھے، ان افراد کی وابستگی سے دارالمصنفین کی علمی عظمت و شہرت میں اضافہ ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ یہ ادارہ بغداد کے بیت الحکمت

کی طرح پوری علمی دنیا کا مرکز بن گیا، اس ادارے کی تصنیفات سے علمی دنیا میں روشنی کی نئی کرنیں پھیلیں، نئے علمی مباحث اور موضوعات سامنے آئے، علمی انکشافات کے دریچے کھل گئے، سیرت و سوانح، تاریخِ اسلامی، علوم و فنون، فلسفہ و عقائد، ادبیات و قرانیات اور دیگر موضوعات پر اس ادارے نے تقریباً ۳۰۰ کتابیں شائع کیں، جن سے پوری ملت نے نہ صرف استفادہ کیا، بلکہ ان کتابوں کی حیثیت مؤرخین اور مصنفین کے لیے مراجع کی حیثیت رکھتی ہیں، متعدد ایسے سلسلے شروع کیے گئے، جن کا مقصد غلط فہمیوں کے دروازے بند کرنا تھا۔

دارالمصنفین کا ارتکاز صرف اسلامی تاریخ و سیرت و سوانح اور فلسفہ و عقائد پر ہی نہیں رہا، بلکہ تاریخِ ہند پر بھی دارالمصنفین نے نہایت اعلیٰ درجے کا کام کیا، تاریخ کو صحیح سمت دی نفرت و عداوت کے بجائے محبت و یگانگت کے مواد کو تاریخ کے نصاب کا حصہ بنایا، اعتدال و توازن کی راہ اختیار کی، عرب و ہند کے تعلقات از سید سلیمان ندوی، ہندوستان عربوں کی نظر میں ضیاء الدین اصلاحی، بزم مملوکیہ، بزم تیموریہ، بزم صوفیا، ہندوستان کے عہد ماضی میں مسلمان حکمران کی مذہبی رواداری، ہندوستان کے عہد وسطیٰ کا فوجی نظام، ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی ایک جھلک، سلاطینِ دہلی کے عہد کا ہندوستان اور اسی طرح کی بہت سی تصنیفات پیش کیں، جس نے ہندوستان کی تاریخ کا اصل چہرہ دکھایا، اعتدال و توازن کی راہ اختیار کی۔

دارالمصنفین نے ادبیات اور اس کی تاریخ پر بھی خاص طور پر توجہ مرکوز کی، موازنہ انیس و دبیر، شعر العجم، اقبال کامل، اردو غزل وغیرہ اسی زمرے کی کتابیں ہیں، مختلف قوموں ملکوں اور شہروں کی مستند تاریخ پر بھی اس ادارے نے کتابیں پیش کیں، تاریخ اندلس، گجرات کی تمدنی تاریخ، طبقات الامم وغیرہ اسی ذیل میں آتی ہیں۔ دارالمصنفین نے اس کے علاوہ سیرت النبی، سیرت صحابہ تابعین و تبع تابعین، تذکرہ و سوانح، قرآنیات، مقالات و خطبات، اسلام اور مستشرقین، مکاتیب و سفر نامے، فلسفہ و کلام، اشاریہ و کتابیات، اہم عصری مسائل، عربی کتب، انگریزی کتب، ہندی کتب، متفرق کتابیں وغیرہ موضوعات پر ایسی مستند و جامع کتابیں شائع کیں، جن کو بڑی مقبولیت و شہرت حاصل ہوئی۔

سیرت النبی جس کی دو جلدیں خود علامہ نے تحریر فرمائی تھیں، علامہ شبلی نے سیرت النبی اس وقت لکھنی شروع کی جب ان کی زندگی لبِ بام آچکی تھی اور وہ اس تصنیف پر زندگی کا خاتمہ بھی چاہتے تھے، خدا کا کرنا بھی کچھ ایسا ہی ہوا کہ ابھی دو جلد ہی تحریر فرمائی تھیں کہ داعیٔ اجل کو لبیک کہا، بقیہ جلدیں ان کے شاگرد رشید سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے قلم سے تکمیل پائیں، سیرت النبی کے علاوہ سیرت صحابہ از معین الدین ندوی، شاہ معین الدین احمد ندوی، مولانا سعید انصاری، عبد السلام ندوی، تابعین، و تبع تابعین، الفاروق، الغزالی، المامون، سیرت النعمان، سیرت عائشہ، حیات شبلی، یادرفتگاں، تاریخ ارض القرآن، مقالات شبلی، خطبات شبلی، اسلام اور مستشرقین سیمینار کی روداد، مکاتیب شبلی، برید فرنگ، سفر نامہ روم و مصر و شام، سفر نامہ افغانستان، الکلام، علم الکلام، برکلے، دروس الادب، بابری مسجد، مطلقہ عورت کا نان و نفقہ، کلیات سہیل، حضرت عائشہ کی جیونی وغیرہ۔ ایسی اہم تصانیف تالیف کی گئیں، جن سے اہلِ علم اور صاحبِ تصانیف نے نہ صرف استفادہ کیا، بلکہ مراجع کی حیثیت حاصل رکھتی ہیں۔

معارف

دارالمصنفین نے اپنے مجلہ معارف کے ذریعہ بھی علمی مباحث دنیا کو متعارف کرایا، نئی علمی تحقیقات کی وجہ سے معارف کو جو اعتبار حاصل ہوا وہ کم ہی رسالوں کو نصیب ہوتا ہے، معارف کی ابتدا ۱۹۱۶ء سے ہوئی تھی، اس وقت سے لے کر اب تک یہ پوری آب و تاب کے ساتھ جاری و ساری ہے۔ اردو زبان کے علاوہ کئی اور زبانوں میں اس کے نادر و نایاب مضامین کے ترجمے کیے جاتے ہیں۔ اس کو اہل علم و اہل قلم نے جس قدر عظمت کی نگاہ سے دیکھا ہے، اس کا اندازہ ایسے ہوتا ہے کہ مولانا آزادؒ نے اپنے گرامی نامہ میں سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کو تحریر فرمایا تھا کہ ''معارف کے متعلق آپ کیا کہتے ہیں؟ صرف یہی ایک پرچہ ہے اور ہر طرف سناٹا ہے۔ ڈاکٹر اقبال مرحومؒ نے اپنا یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ یہ ایک ایسا رسالہ ہے جس کے پڑھنے سے حرارت ایمانی میں ترقی ہوتی ہے''۔

علاوہ ازیں معارف نے درجنوں ایسے لکھنے والے پیدا کر دیے جس نے قدیم وجدید دونوں طبقوں کو متاثر کیا، قدیم طبقہ کو اسلامی علوم و فنون کی خدمات کے نئے وسائل اور علم کی تحقیق و تنقید اور انشاء و تحریر کے نئے انداز سے نئے اسلوب سے متاثر کیا اور جدید طبقوں کو اپنی تاریخ اور علوم اسلامیہ کی طرف موڑا، معارف نے سینکڑوں علمی موضوعات پر بڑا ذخیرہ جمع کر دیا ہے، جس سے اسلامی انسائیکلوپیڈیا تیار کہا جا سکتا ہے، اس کی شہادت کے لیے وفیاتِ معارف، اشاریۂ معارف وغیرہ دیکھے جا سکتے ہیں۔

دارالمصنفین کی خدمات کا ایک حصہ یہ بھی ہے کہ دارالمصنفین کے ذریعہ مختلف موضوعات پر سیمینار کا سلسلہ جاری رہتا ہے، اس سلسلے میں فروری ۱۹۸۲ء میں اسلام اور مستشرقین کے عنوان سے جو بین الاقوامی سیمینار ہوا، وہ خاصی اہمیت کا حامل رہا۔ سب سے بڑی کامیابی دارالمصنفین کی یہ تھی کہ علامہ نے جب اس کے قیام کا ارادہ کیا تو علامہ کو ایسے رفقاء و تلامذہ نصیب ہوئے جنھوں نے علامہ کی وفات کے بعد دارالمصنفین کو پروان چڑھانے میں قدم قدم پر ساتھ دیا اور علامہ کے خواب کو اپنا خواب سمجھ کر پورا کرنے کی سعی کی، سید سلیمان ندویؒ جنھوں نے پورے ۳۶ برس منسلک رہ کر اس کو بام عروج پر پہنچایا، اپنی گراں قدر تصنیفات سے اس کو جلا بخشی اور رسالہ معارف کے ذریعہ افکارِ شبلی کی اشاعت کرتے رہے، عبدالسلام ندوی جنھوں نے ابتدا ہی سے دارالمصنفین میں تصنیف و تالیف کے فرائض انجام دیے، سیرت صحابہ، اسوہ صحابہ، سیرت عمر بن عبدالعزیز، اقبال کامل، القضا فی الاسلام، اسلامی فوجداری، امام رازی، شعر الہند، ترجمہ ابن خلدون وغیرہ لکھ کر شبلی کی علمی امانت کا حق ادا کر دیا۔

وہیں شبلی کے تلامذہ اور دارالمصنفین کے اولین خادموں میں حاجی معین الدین ندویؒ نے بھی صحابہ سیریز کی مہاجرین کی دو جلدیں اور خلفائے راشدین تصنیف فرما کر عشق صحابہ کا حق ادا کر دیا اور اسی طرح مولانا سعید انصاری، سید ریاست علی ندوی، مولانا حمید الدین فراہی، مولانا مسعود علی ندوی، یہ وہ شخصیات تھیں جنھوں نے دارالمصنفین کی علم پرور فضا میں رہ کر تصنیف و تالیف کے فرائض انجام دینے کے ساتھ ساتھ دارالمصنفین کے وقار کو بھی اسی طرح قائم رکھا جس طرح علامہ شبلی چاہتے تھے اور آج بھی الحمدللہ یہ ادارہ اپنے اخلاص کی وجہ سے پوری آب و تاب کے ساتھ قائم و دائم ہے۔

(بقیہ ص:۵۷ پر)

تحقیق وتنقید **(قسط:۲۶)**

اہلِ کتاب کے ایمان وکفر کے سلسلہ میں بعض مغالطے اور ان کا ازالہ

مولانا محمد غزالی ندویؒ
بانی: امام بخاری ریسرچ اکیڈمی

گیارھواں مغالطہ: رسول اللہ ﷺ مختلف اقوام پر مشتمل ایک عالمی ربّانی معاشرے کی تشکیل چاہتے تھے۔

بعض لوگ یہ مغالطہ دیتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ یہود ونصاریٰ وشبہ اہل کتاب اور دنیا کی مختلف اقوام پر مشتمل ایک عالمی ربانی معاشرہ تشکیل دینا چاہتے تھے، اس لیے ہمیں بھی آج مختلف امتوں پر مشتمل ایک عالمی ربانی معاشرے کے قیام کی جستجو کرنی چاہیے۔

ازالہ: یہ بات ہی سرے سے غلط ہے کہ محمد ﷺ تمام اقوام عالم پر مشتمل ایک ربانی معاشرے کا قیام چاہتے تھے؛ اس لیے کہ ربانی، اللہ والوں اور اللہ کے فرماں برداروں کو کہتے ہیں۔ اور متبعین محمد کے سوا آج کسی بھی قوم کے پاس خدا کے فرامین کا مستند وثیقہ نہیں ہے، اس وجہ سے اُن کے سوا ہر قوم خدا کے حکم اور اُس کی منشا کے خلاف چل رہی ہے۔ اور ان کے سوا کوئی بھی ربانی نہیں ہے۔ ایسی صورت میں غور کیجیے! کیا آپ نافرمانوں پر مشتمل ایک فرماں بردار جماعت کا تصور کر سکتے ہیں؟ ناکاروں پر مشتمل ایک طاقتور فوج کا تصور کر سکتے ہیں؟ ان پڑھ لوگوں پر مشتمل اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ کا تصور کر سکتے ہیں؟ اگر یہ نہیں ہو سکتا، تو پھر خدا کی نافرمانی کرنے والوں، خدا کے رسول اور خدا کی کتاب کا انکار کرنے والوں پر مشتمل ایک فرماں بردار جماعت کا تصور کیوں کر ہو سکتا ہے؟ اور اُن پر مشتمل کسی ربانی معاشرے کا قیام کیوں کر ممکن ہے؟

بارھواں مغالطہ: رسالت محمدی کی دعوت دینے والی آیات میں تحریف معنوی کی کوشش۔

یہود ونصاری کو مسلمان ثابت کرنے کی کوشش کرنے والے بسا اوقات اپنی مہم میں اتنے پرجوش ہو جاتے ہیں کہ وہ قرآنی آیات کو ادھورا نقل کرنے، دوسری آیات سے بے جوڑ انداز میں مربوط کرنے اور آیات میں تحریف معنوی کرنے سے بھی باز نہیں آتے۔ مثلاً: ڈاکٹر راشد شاز صاحب نے {قُلْ يَاأَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا} کو {صِبْغَةَ اللَّهِ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللَّهِ صِبْغَةً} [البقرۃ:۱۳۸] کے پس منظر میں سمجھنے کی کوشش کی ہے، اور بزعم خود یہ نتیجہ نکالا ہے کہ یہ دونوں آیتیں مل کر تمام اقوام عالم پر مشتمل ایک ربانی معاشرہ قائم کرنے کی دعوت دیتی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"{صِبْغَةَ اللَّهِ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللَّهِ صِبْغَةً} [البقرۃ:۱۳۸] کے پس منظر میں {قُلْ يَاأَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا} پر غور کرنے سے یہ بات بآسانی سمجھ میں آسکتی ہے کہ تمام اقوام عالم پر مشتمل ایک ربانی معاشرے کے قیام کا خواب اُس وقت تک شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا، جب تک کہ اُس کی بنیاد ایسے کلمے پر نہ رکھی گئی ہو، جو سبھی ایمانی طائفوں کے لیے قابل قبول ہو اور جس میں غایت دین کا ارتکاز بھی پایا جاتا ہو۔ کلمۂ سواء، تبدیلیٔ مذہب کی دعوت نہ تھی؛ بلکہ سابقہ ایمانی

طائفوں کے لیے اشتراک عمل کی ایک نظری بنیاد تھی"۔ (۱)

ازالہ:

۱- پہلی بات یہ کہ تمام اقوام عالم پر مشتمل ایک ربانی معاشرے کے قیام کا تصور بالکل اسی طرح فضول ہے جس طرح ہاتھ پیر اور سماعت وبینائی سے معذور اپاہجوں پر مشتمل ایک طاقت ور فوج کی تشکیل کا تصور عبث ہے، جیسا کہ ہم اس سے پہلے والے مغالطے میں ذکر کر چکے ہیں۔

۲- {قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ} کو جس آیت {صِبْغَةَ اللّٰهِ} سے جوڑ کر سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے، خود اس کا سیاق یہ بتا رہا ہے کہ اہل کتاب تب ہی ہدایت پر ہوں گے، جب وہ ان تمام چیزوں پر ایمان لے آئیں جن پر مسلمان ایمان رکھتے ہیں۔ بقول قرآن: {فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَاۤ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا} [البقرۃ:۱۳۷]۔ "اس کے بعد اگر یہ لوگ بھی اسی طرح ایمان لے آئیں جیسے تم ایمان لائے ہو، تو یہ راہ راست پر آجائیں گے"۔

۳- ڈاکٹر صاحب نے آیت قرآنی {قُلْ يٰاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا} کو ادھورا نقل کیا ہے۔ اگر وہ اس آیت کو مکمل نقل کر دیتے، تو ان کے موقف کی غلطی خود واضح ہو جاتی۔ پوری آیت پر اگر نظر ڈالی جائے تو وہ اقوام عالم پر مشتمل کسی مخلوط ربانی معاشرے کو قائم کرنے سے بالکل ہٹ کر بعثت محمدی ﷺ کا مقصد یہ بتاتی ہے کہ سارے انسان آپ ﷺ پر ایمان لائیں اور آپ ﷺ کی اتباع کریں۔ پوری آیت پڑھیے: {قُلْ يٰاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعَا الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ الَّذِيْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ} [الأعراف:۱۵۸]۔ "کہہ دو، اے لوگو! میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہو کر آیا ہوں، اس اللہ کا جس کے لیے ہی آسمانوں اور زمین کی بادشاہی ہے۔ وہی جلاتا اور وہی مارتا ہے۔ پس ایمان لاؤ اللہ اور اس کے نبی امی رسول پر جو ایمان رکھتا ہے اللہ اور اس کے کلمات پر، اور اس کی پیروی کرو؛ تاکہ تم راہ یاب ہو"۔

کیا اس آیت میں کسی طرح کے مخلوط ربانی معاشرے کے قیام کا ذکر ہے؟ حیرت ہوتی ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے {قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّيْ رَسُولُ اللّٰهِ إِلَيْكُمْ جَمِيْعاً} کو اس کے سیاق وسباق سے ہٹا کر سمجھنے کی کوشش کیوں کی؟ اور وہ {قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّيْ رَسُولُ اللّٰهِ إِلَيْكُمْ جَمِيْعاً} کو سمجھنے کے لیے اسی آیت کے آخری ٹکڑے {وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ} کو چھوڑ کر ایک دوسری آیت {صِبْغَةَ اللّٰهِ} کے پس منظر میں سمجھنے کی دعوت کیوں دینے لگے؟ کیا ایسا کرنا مختلف قرآنی آیات کے ناتمام ٹکڑوں سے باطل افکار برآمد کرنے کی کوشش نہیں ہے؟

غور کیا جائے تو ان کا یہ طرز استدلال بالکل ایسا ہے جیسے کوئی کہے کہ {يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ} [النساء:۴۳] کے پس منظر میں {فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ} [الماعون:۴] پر نظر کرنے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ نماز پڑھنا بہت بڑا گناہ ہے۔ آپ اس سے یہی تو کہیں گے کہ بھائی آپ نے {يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ} کو اس کے سیاق {وَأَنْتُمْ سُكَارٰى

{حَتّٰى تَعْلَمُوْا} سے الگ کر دیا اور {فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ} کو اس کے سیاق سے کاٹ دیا۔ اس طرح کی خرد برد سے ایسے نامعقول نتائج ہی تو برآمد ہوں گے۔ بالکل اسی طرح ڈاکٹر صاحب نے {قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعاً} کو اس کے سیاق {فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِىِّ الْاُمِّىِّ الَّذِىْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ} سے اور صبغۃ اللہ کو اس کے سیاق {فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا} سے کاٹ دیا، تو اس طرح کے غیر علمی منہج سے ایسے غلط نتائج کے سوا اور کیا چیز برآمد ہو سکتی ہے۔

تیرھواں مغالطہ: دستورِ مدینہ کا مغالطہ۔

رسول اللہ ﷺ نے مدینہ تشریف لانے کے بعد مدینے کی اجتماعی زندگی کے لیے ایک دستور تیار کیا تھا، جس کے مطابق مسلمانوں اور یہود سب کو عمل کرنا تھا۔ اس دستور کا حوالہ دیتے ہوئے بعض لوگ یہ مغالطہ دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ نے اس معاہدے کے ذریعے مختلف اہل مذاہب کے تعاون سے ایک ایسی نظری امت وجود میں لانے کی کوشش کی تھی جو ربانی شناخت رکھتی ہو۔ ڈاکٹر راشد شاز لکھتے ہیں:

"بعض محققین نے صحیفے کو دستور مدینہ کی حیثیت سے پڑھنے کی کوشش کی ہے؛ حالانکہ صحیفے کی حیثیت کسی قانونی دستاویز کے بجائے ایک ایسے محضر نامے کی ہے جہاں مختلف دین و ملل کے تعاون سے ایک ایسی نظری امت کی تشکیل کی کوشش ہے جو ربانی شناخت سے متصف ہو"۔(۲)

ازالہ: مختلف ادیان و ملل کے تعاون سے ربانی شناخت سے متصف ایک معاشرہ یا امت نہ تشکیل پا سکتی ہے نہ ایسا غیر عملی و غیر حقیقی کام محمد رسول اللہ ﷺ کر سکتے ہیں۔ اس معاہدے کی حیثیت حقیقتاً ایک دستور کی تھی۔ ہر ایسی ریاست میں (جس میں کئی مذاہب کے ماننے والے رہتے ہوں) ایک ایسا دستور بنایا جاتا ہے جس پر سب کے لیے یکساں طور پر عمل کرنا ضروری ہوتا ہے۔ بالکل اسی طرح مدینے کے لیے یہ دستور مرتب کیا گیا تھا۔ اس دستور کے ذریعے ہر گز ان کے دین، ان کی عبادات، ان کے اعمال اور ان کے عقائد کو صحت کی سند فراہم کرنا مقصود نہ تھا؛ بلکہ ان تمام چیزوں سے قطع نظر ریاست کے لیے ان کی وفاداری کو یقینی بنانا، ان کے اور مسلمانوں کے تعلقات کی نوعیت کو واضح کرنا اس دستور کا مقصد تھا۔ مدینے کے تمام باسی مل کر سیاسی طور پر ضرور ایک قوم اور ایک امت کو تشکیل دے رہے تھے؛ لیکن اس سے آگے دینی اعتبار سے ان کے درمیان کتنا بعد المشرقین تھا، اس کو صحیفے کا یہ جملہ واضح کرتا ہے: "لَهُمْ دِيْنُهُمْ وَلِلْمُسْلِمِيْنَ دِيْنُهُمْ"(۳)۔ یہود کے دین کو مسلمانوں کے دین سے الگ قرار دینا اس بات کی طرف واضح اشارہ تھا کہ قرآن اور محمد ﷺ کو تسلیم نہ کر کے یہود راہ سیدھی سے منحرف ہو چکے ہیں، اس لیے ان کا دین مسلمانوں سے الگ ہے؛ البتہ بہر حال مدینے کی ریاست میں ان کو اپنے دین پر عمل کی مکمل آزادی ہوگی۔ جس طرح ہر ملک کا دستور اپنے شہریوں کو اپنے اپنے مذہب پر عمل کی آزادی دیتا ہے، اسی طرح صحیفۂ مدینہ نے یہودیوں کو ان کے مذہب پر عمل کی آزادی عطا کی تھی۔ انھیں اس بات کی ضمانت دی گئی تھی کہ وہ محمد رسول اللہ ﷺ کو رسول اور قرآن کو اللہ کی کتاب خواہ تسلیم کریں یا نہ کریں؛ مگر ان کو تمام حقوق حاصل رہیں گے۔ یہ الگ بحث

ہے کہ فی نفسہ ان کا یہ عمل کیسا ہے، اور رسول کا انکار اور خدا کی کتاب کا انکار کرنے کے اخروی نتائج کیا ہوں گے؛ مگر صحیفے نے اس بات سے کوئی بحث نہیں کی تھی۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ایسا کرنا صحیفے کے دائرہ کار سے باہر تھا؛ اس لیے کہ صحیفہ کوئی دعوتی خط نہ تھا؛ بلکہ وہ تو مختلف الخیال، مختلف المزاج اور مختلف المذاہب لوگوں کے لیے یکساں ریاستی قانون تھا۔ "وَلِلْمُسْلِمِيْنَ دِيْنُهُمْ "کا فقرہ صاف اشارہ دے رہا ہے کہ یہود، امت مسلمہ میں شامل نہیں ہیں۔ اگر وہ شامل ہوتے، تو اس اس جملے کے ذریعے انھیں مسلمانوں سے الگ نہ کیا جاتا۔

ثانیاً اگر صحیفے کا مقصد یہودیوں کو باوجود قرآن اور رسول کے انکار کے امت مسلمہ کا حصہ شمار کرنا ہوتا، تو پھر صحیفے کے تیار ہونے کے بعد جو قرآنی آیات نازل ہوئیں، ان میں قرآن کا انکار کرنے کی وجہ سے یہودیوں کو کافر نہ کہا جاتا۔

چودھواں مغالطہ: مسلمان، اسلام کو محمدی الاصل سمجھتے ہیں۔

بعض لوگ یہ مغالطہ دیتے ہیں کہ محمد ﷺ پر ایمان لانے اور آپ کی اتباع کو نجات کے لیے ضروری قرار دینا، اسلام کو محمدی الاصل Mohammad centered بنانے کی کوشش ہے۔

ازالہ: مسلمانوں کے یہاں اسلام کبھی محمدی الاصل نہیں رہا۔ اگر ایسا ہوتا تو مسلمان محمد ﷺ سے پہلے آنے والے انبیا علیہم السلام کو بھی کافر سمجھتے، اور جو لوگ ان انبیا علیہم السلام کے زمانے میں ان پر ایمان لائے تھے، ان کو بھی کافر سمجھتے؛ لیکن ایسا نہیں ہے۔ مسلمان ان سب کو اپنی طرح مسلمان سمجھتے ہیں۔ پھر یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ مسلمان، اسلام کو محمدی الاصل سمجھتے ہیں۔

رہا یہ سوال کہ اگر مسلمان اسلام کو محمدی الاصل نہیں سمجھتے، تو پھر محمد ﷺ کی آمد کے بعد سب کے لیے ان کی اتباع کو کیوں ضروری قرار دیتے ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اسلام خدا کے حکم کو بے چوں چرا ماننے کا نام ہے، اور اب خدا کا حکم یہی ہے کہ سب محمد ﷺ کی اتباع کریں۔

پندرھواں مغالطہ: تورات وانجیل بھی قرآن کی طرح خدا کی کتابیں ہیں؛ اس لیے ان میں سے کسی کی بھی اتباع کی جا سکتی ہے۔

بعض لوگ یہ مغالطہ دیتے ہیں کہ جس طرح قرآن خدا کی کتاب ہے، اسی طرح تورات وانجیل بھی خدا کی کتابیں ہیں، اور ان میں سے ہر ایک میں ہدایت اور روشنی موجود ہے، اس لیے ان میں سے کسی کی بھی اتباع کی جا سکتی ہے۔

ڈاکٹر راشد شاز لکھتے ہیں: "اگر خدا ترسوں کے مختلف گروہ انبیائے سابقین کی باقیات وذریات، خود کو راہ یابی کے مختلف سلسلوں سے وابستہ پاتے ہوں، تو انھیں جان لینا چاہیے کہ تورات وانجیل بھی اسی خدا کی کتاب ہے، اور وہاں بھی ہدایت اور روشنی موجود ہے"۔(۴)

ازالہ: بلاشبہ تورات وانجیل خدا کی کتابیں تھیں، جنھیں اللہ تعالی نے اپنے مقرب ترین انبیا علیہم السلام پر نازل کیا تھا؛ لیکن موجودہ تورات وانجیل وہ کتابیں نہیں ہیں جنھیں اللہ نے نازل فرمایا تھا۔ اس کے مفصل دلائل چھٹی فصل میں گزر چکے ہیں۔ یہاں صرف ایک تحریر نقل کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے جو خود ڈاکٹر راشد شاز صاحب کی ہے، قطع نظر اس سے کہ ڈاکٹر صاحب کی سابقہ تحریر اور اس تحریر کے درمیان کتنا تناقض ہے۔ درج ذیل تحریر کو پڑھ کر اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ صحف سابقہ اپنی موجودہ

شکل میں کس قدر نا قابل اعتبار ہیں۔ ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

''نزول قرآن کے وقت اہل کتاب کے پاس الہامی تعلیمات مخصوص کتابی شکل میں محفوظ نہ تھیں۔ کوئی ایسی کتاب نہ تھی جسے کامل اور خالص وحی کے طور پر پیش کیا جاسکے۔ عیسائیوں کی انجیل، اقوال عیسی اور ان کی تعلیمات پر مشتمل تھیں جو ان کے حواریوں یا بعد کے شاگردوں نے جمع کیا تھا اور جسے عہد نامہ قدیم پر اضافے کی حیثیت حاصل تھی۔ رہا عہد نامہ قدیم، تو یہاں بھی تورات کوئی مخصوص کتاب نہ تھی.... جب بنی اسرائیل کے انبیا لوگوں کو قوانین الٰہی کے اتباع کی دعوت دیتے ہیں، تو ان کی نظر میں اس حوالے سے کسی مخصوص کتاب یا مرتب شدہ صحیفہ نہیں ہوتا۔ انبیائے یہود کی آخری کتاب Malachi اس اپیل پر ختم ہوتی ہے کہ لوگو! شریعت موسوی یا قوانین موسوی کا پاس رکھو۔ البتہ یہ شریعت موسوی کہاں پائی جاتی ہے، اس بارے میں کسی مخصوص صحیفے کی طرف یہاں بھی اشارہ نہیں ملتا۔ رہی pentateuch کی بات، تو خود یہودی محققین اس بات کے قائل ہیں اور خود خمسہ موسوی کی اندرونی شہادت سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ یہ تمام کی تمام پانچوں کتابیں صرف تعلیمات موسوی یا وحی موسوی پر مشتمل نہیں ہیں، لہذا شریعت موسوی کے طالب کے لیے صدیوں پر مشتمل مقدس یہودی لٹریچر بشمول بائبل اور اس کے متعلقات کی چھان بین لازم ہو جاتی ہے اور اس کے بعد بھی وثوق سے یہ پتہ نہیں چل سکتا کہ پیغمبروں اور ربائیوں کی ان تشریح وتاویل میں حق ہے کہاں اور خدا کو واقعی کیا مطلوب ہے؟ اس کے برعکس قرآن کو اس بارے میں فوقیت حاصل ہے کہ یہاں خالص اور کامل وحی دفتین میں موجود ہے۔ یہی وہ لوح محفوظ ہے جو زبانی طریقۂ روایات کے مقابلے میں قرآن مجید کو دوسرے تمام معلوم صحف سماوی سے ممیز کرتا ہے۔''(۵)

ایک دوسری جگہ وہ لکھتے ہیں: ''تورات کی ان تمام تر فضیلتوں کے باوجود، جو اہل یہود کے عقیدے کا لازمہ ہے، امر واقعہ یہ ہے کہ پوری تاریخ، تورات سے براہِ راست روشنی حاصل کرنے کے عمل سے خالی ہے۔ اولاً انھوں نے اصل تورات کو ضائع کر دیا کہ خود یہودی محققین اور علما کے مطابق موجودہ تورات معبد کے دوسرے انہدام (AD70) کے بعد کی پیداوار ہے۔ خمسہ موسوی کی آخری کتاب (Deuteronomy) کے آخری حصے میں اس بات کی اندرونی شہادت موجود ہے کہ یہ صحیفے اصل تورات کو محفوظ کرنے کی کوششوں کے نتیجے میں وجود میں آئے ہیں۔ گویا الواح موسیٰ کے ذریعے وحی کی راست تجلّی جو بنی اسرائیل کے حصے میں آئی تھی، وہ بڑی حد تک ضائع ہو گئی''۔(۶)

(۲) اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ تورات وانجیل اپنی اصل حالت میں موجود ہیں، تو بھی ان کے احکامات دو قسم کے ہوں گے، یا تو ان میں اور قرآن میں مطابقت ہو گی، یا نہیں ہو گی۔ اگر مطابقت ہو، تو بہت اچھا۔ اگر مطابقت نہ ہو، تو پھر عقل و شریعت دونوں کا تقاضا ہے کہ ان امور میں قرآن کی اتباع کی جائے۔

عقلی وجہ تو اس مثال سے سمجھیے کہ حاکم اگر دستور کی کوئی کتاب مرتب کروا کر آپ کے پاس بھیجے، پھر کچھ دنوں کے بعد وہ موجودہ وقت کے تناظر میں کچھ تبدیلیاں کر کے پھر سے وہ کتاب آپ کے پاس بھیجے۔ دو مختلف اوقات میں قانون کی یہ دو کتابیں جو آپ کے پاس پہنچی ہیں، ان میں کچھ چیزیں تو یکساں ہوں گی اور کچھ الگ الگ۔ جن چیزوں میں ان دو کتابوں میں اختلاف

ہوگا،ان میں انسان پرانی کتاب کے مقابلے میں نئی کتاب کو ہی نافذ العمل مانے گا۔اسی طرح یہاں سمجھ لیجیے۔

شرعی اعتبار سے اس وجہ سے کہ خود تورات وانجیل میں ہرآنے والے رسول اور خاص طور پر آخری نبی رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے،آپ کی اتباع کرنے اورآپ کی نصرت کرنے پر زور دیا گیا تھا۔

سولھواں مغالطہ: اہل کتاب کا مذہب بھی قابل اتباع ہے۔

بعض لوگ یہ مغالطہ دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ اب محمد ﷺ کی اتباع کو راہ یابی کے لیے لازم قرار دینا اسی طرح کا عمل ہے جو یہود ونصاری کرتے رہے ہیں۔یہودیوں نے نجات اور راہ یابی کو یہودیت کی پیروی اور عیسائیوں نے عیسائیت کی پیروی میں منحصر کر دیا، جس کی مذمت قرآن میں اس طرح بیان کی گئی:

{وَلَن تَرْضَىٰ عَنكَ الْيَهُودُ وَلَا النَّصَارَىٰ حَتَّىٰ تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ} [البقرة:۱۲۰]"اور یہود ونصاریٰ تم سے اس وقت ہر گز راضی نہیں ہوں گے،جب تک تم ان کے مذہب کی پیروی نہیں کروگے"۔

ازالہ: آیت قرآنی کے اس ٹکڑے میں صرف اتنی بات بتائی گئی ہے کہ یہود ونصاری اس وقت تک آپ سے خوش نہیں ہوں گے جب تک آپ ان کے مذہب کی پیروی نہ کرلیں؛البتہ کیا فی نفسہ ان کا مذہب قابل اتباع ہے؟ یہ بات نہیں بتائی گئی ہے،اس لیے صرف اتنے سے ٹکڑے سے مذکورہ استدلال نہیں کیا جاسکتا۔

فی نفسہ ان کا مذہب ہے کیسا؟ وہ مذہب قابل اتباع ہے یا نہیں؟اس پہلو پر {وَلَن تَرْضَىٰ عَنكَ الْيَهُودُ وَلَا النَّصَارَىٰ حَتَّىٰ تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ} کے بعد اسی آیت کے آخر میں وضاحت کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے،اور یہ کہا گیا ہے کہ قرآن آنے کے بعد اب ان کی ملت کی پیروی اتباع ہوی کے سوا کچھ نہیں ہے:

{وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ أَهْوَاءَهُم بَعْدَ الَّذِي جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَكَ مِنَ اللَّهِ مِن وَلِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ} [البقرة:۱۲۰] "اے محمد ﷺ! اگر آپ نے علم آچکنے کے بعد ان کی خواہشات کی پیروی کی،توآپ کو اللہ سے کوئی بچانے والا اور مددگار نہ ہوگا"۔

غور کیا جائے کہ اگر ان کا مذہب صحیح اور قابل اتباع ہوتا،تو نہ تو اسے "ھوی" سے تعبیر کیا جاتا اور نہ ہی اس کی اتباع پر شدید وعید سنائی جاتی۔

سترھواں مغالطہ: سب کو محمد ﷺ کی اتباع کی دعوت دینا غلط ہے۔

بعض لوگ یہ مغالطہ دیتے ہیں کہ جس طرح محمد ﷺ کے زمانے میں اہل کتاب (یہود ونصاری) اپنے اپنے مذہب کی طرف بلاکر یہ کہتے تھے کہ یہودی ہو جاؤ یا عیسائی ہو جاؤ،راہ یاب ہو جاؤ گے،جس کی وجہ سے قرآن نے ان پر نکیر کی اور انھیں ملت ابراہیمی کی پیروی کا حکم دیا:{وَقَالُوا كُونُوا هُودًا أَوْ نَصَارَىٰ تَهْتَدُوا قُلْ بَلْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا} [البقرة:۱۳۵]۔"اور یہ (یہودی اور عیسائی مسلمانوں سے) کہتے ہیں کہ تم یہودی یا عیسائی ہو جاؤ،راہ راست پر آجاؤ گے۔کہہ دو کہ نہیں؛بلکہ (ہم تو) ابراہیم کے دین کی پیروی کریں گے،جو ٹھیک ٹھیک سیدھی راہ پر تھے"۔

آج یہی غلطی مسلمان بھی کررہے ہیں کہ وہ بھی سب کو اپنے مذہب کی طرف بلاکر یہ کہتے ہیں کہ محمد ﷺ کی اتباع

کرلو، ہدایت پاجاؤ گے۔

ازالہ: جس قرآن نے یہود ونصاریٰ کے اس قول {كُونُواْ هُوداً أَوْ نَصَارَىٰ تَهْتَدُوا} کو غلط کہا ہے، اور انھیں ملت ابراہیمی کی پیروی کا حکم دیا ہے، اُسی قرآن نے محمد ﷺ کی اتباع کی طرف سارے انسانوں کو بلاتے ہوئے کہا ہے: {وَاتَّبِعُوهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ} [الأعراف:۱۵۸]۔ "اور اس کی پیروی کرو، تاکہ تمھیں ہدایت حاصل ہو"۔

اس سے معلوم ہوا کہ اگر حضرت محمد ﷺ کی اتباع کی طرف بلانا غلط ہوتا اور یہود ونصاریٰ کے قول {كُونُواْ هُوداً أَوْ نَصَارَىٰ تَهْتَدُوا} کے مشابہ ہوتا، تو یہ کام خود قرآن نہ کرتا۔

رہا سوال کہ پھر قرآن نے یہود ونصاریٰ کے اس قول پر نکیر کیوں کی؟ تو اُس کی وجہ یہ ہے کہ اس وقت یہودیت اور عیسائیت دونوں انسانوں کے تشکیل کردہ مذاہب تھے۔ اُن کے ماننے والے خود ہی بے راہ تھے، تو اُن کے لیے کسی سے یہ کہنا کیوں کر درست ہوتا کہ تم ہمارے مذہب کو مان لو، راہ یاب ہو جاؤ گے۔ مثلاً تحریفات سے قطع نظر یہود، حضرت عیسیٰ کو نبی نہیں مانتے تھے اور انجیل کو خدا کی کتاب تسلیم نہیں کرتے تھے، تو خدا کے ایک برگزیدہ نبی اور عظیم الشان کتاب کا انکار کر کے وہ صاحب ایمان، ابراہیمی اور راہ یاب کیسے ہو سکتے تھے؟ اسی طرح عیسائیت بے شمار شرکیات وغیرہ کا مجموعہ ہونے کے علاوہ مکمل طور پر "پولس" کی ایجاد تھی، جس نے عیسائیوں سے شریعت کی قید ہی ہٹادی تھی۔ ایسے مذہب کو ماننے والے کیوں کر صاحب ایمان، ابراہیمی اور راہ یاب ہو سکتے تھے؟ اس لیے یہودیوں اور عیسائیوں دونوں سے ملت ابراہیمی کی پیروی کے لیے کہا گیا، جس کا جامع ترین، مکمل ترین، اور صحیح ترین نسخہ رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات کی شکل میں آگیا تھا کہ خود محمد ﷺ اسی ملت ابراہیمی کے پیروکار تھے: {ثُمَّ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ أَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفاً} [النحل:۱۲۳]۔

"پھر (اے پیغمبر!) ہم نے تم پر بھی وحی کے ذریعے یہ حکم نازل کیا ہے کہ تم ابراہیم کے دین کی پیروی کرو، جس نے اپنا رُخ اللہ ہی کی طرف کیا ہوا تھا"۔

اٹھارھواں مغالطہ: ہمیں اہل کتاب کے بارے میں یہ نہیں کہنا چاہیے کہ وہ نجات نہیں پائیں گے۔

بعض لوگ یہ مغالطہ دیتے ہیں کہ ہمیں اہل کتاب یا دوسرے اہل مذاہب کے بارے میں یہ نہیں کہنا چاہیے کہ وہ نجات نہیں پائیں گے؛ اس لیے کہ اس بارے میں کوئی گفتگو ہمارے دائرۂ اختیار سے باہر ہے۔

ڈاکٹر راشد شاز لکھتے ہیں: "قرآن مجید نجات جیسے مسئلے کو سرے سے انسانی بحث و تمحیص کے دائرے سے باہر قرار دیتا ہے۔ روز آخر کون جنت میں جائے گا اور کسے واصل جہنم کیا جائے گا، یہ وہ حساس امور ہیں جن پر کوئی قول فیصل انسانوں کے بس کی بات نہیں۔ اہل کتاب کو تو چھوڑیے، اُنھیں تو قرآن دین محمدی کے فطری حلیف کے طور پر پیش کرتا ہے، حتیٰ کہ وہ لوگ بھی جن کے دامن شرک سے آلودہ ہو گئے، اُن کے لیے بھی خدا کا ارشاد ہے کہ سزا و جزا کا یہ فیصلہ وہ بذات خود روز حشر انجام دے گا۔ اس بارے میں کوئی گفتگو انسانوں کے دائرۂ اختیار سے باہر ہے: {إِنَّ اللَّهَ يَفْصِلُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ} [الحج:۱۷]۔"(۷)

ازالہ: یقیناً مسلمان اگر خود سے کسی کو ناجی اور کسی کو واصل جہنم قرار دینے لگیں، تو یہ غلط ہوگا اور ان کے دائرۂ اختیار سے باہر

کی چیز ہوگی؛ لیکن جب مسلمان صرف خدا کا قول نقل کریں اور جس کو اس نے جنتی یا جہنمی کہا ہے، وہ بھی اسی کو دوہرائیں، تو اس میں کیوں کر حرج ہے؟ مثلاً:

۱- سورۂ بینہ میں خدا نے مشرکوں اور اہل کتاب دونوں ہی کو کافر بتا کر ہمیشہ ہمیش کے لیے دوزخ کی بشارت دی ہے:
{إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ وَالْمُشْرِكِينَ فِي نَارِ جَهَنَّمَ خَالِدِينَ فِيهَا أُولَئِكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ} [البینۃ:۶]۔ ”یقین جانو کہ اہل کتاب اور مشرکین میں سے جنھوں نے کفر اپنا لیا ہے، وہ جہنم کی آگ میں جائیں گے جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ یہ لوگ ساری مخلوق میں سب سے برے ہیں“۔

۲- قرآن کا انکار کرنے کی وجہ سے سورۂ بقرہ میں یہودیوں کو کافر کہا گیا اور ذلت آمیز عذاب کی وعید سنائی گئی: {بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهِ أَنْفُسَهُمْ أَنْ يَكْفُرُوا بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ بَغْيًا أَنْ يُنَزِّلَ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ عَلَى مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ فَبَاءُوا بِغَضَبٍ عَلَى غَضَبٍ وَلِلْكَافِرِينَ عَذَابٌ مُهِينٌ} [البقرۃ: ۹۰]۔ ”بری ہے وہ قیمت جس کے بدلے انھوں نے اپنی جانوں کو بیچ ڈالا ہے، کہ یہ اللہ کی نازل کی ہوئی کتاب کا صرف اس جلن کی بنا پر انکار کر رہے ہیں کہ اللہ اپنے فضل کا کوئی حصہ (یعنی وحی) اپنے بندوں میں سے جس پر چاہ رہا ہے (کیوں) اتار رہا ہے؟ چنانچہ یہ (اپنی اس جلن کی وجہ سے) غضب بالائے غضب لے کر لوٹے ہیں۔ اور کافر لوگ ذلت آمیز سزا کے مستحق ہیں“۔

۳- سورۂ مائدہ، آیت: ۸۶ میں ان عیسائیوں کی تعریف وتوصیف کے بعد جو قرآن اور محمد ﷺ پر ایمان لے آئے تھے، ایمان نہ لانے والوں کو أصحاب الجحيم (دوزخی) کہا گیا ہے: {وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا أُولَئِكَ أَصْحَابُ الْجَحِيمِ} ”اور جنھوں نے کفر کیا اور ہماری آیات کو جھٹلایا، وہ دوزخ میں پڑنے والے ہیں“۔

اب ان تصریحات کو پڑھنے کے بعد بھی کیا مسلمان خدا کی آیات کا انکار کرنے والے اہل کتاب اور دوسرے اہل مذاہب کے بارے میں یہ نہ سمجھیں کہ وہ دوزخ میں جائیں گے اور اُن کی ہدایت کی فکر نہ کریں؟ یہ کیسی منطق ہے؟

دنیا ہی میں ہم دیکھتے ہیں کہ کسی مجرم کے تعلق سے کوئی فیصلہ دینا عام انسان کے دائرۂ اختیار سے باہر ہوتا ہے۔ بڑے سے بڑے مجرم کے تعلق سے کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ اسے پھانسی ہو جائے گی؛ لیکن جب عدالت عظمیٰ اس کے بارے میں فیصلہ دے دے کہ اسے پھانسی ہوگی، تو کیا پھر بھی یہ کہنا کہ اسے پھانسی ہوگی، عام انسان کے دائرۂ اختیار سے باہر ہے؟

رہا {إِنَّ اللَّهَ يَفْصِلُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ} [الحج:۱۷] سے استدلال کرنا تو وہ درست نہیں ہے؛ اس لیے کہ اس آیت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ خدا نے اب تک ایمان والوں اور غیر ایمان والوں کا حشر نہیں بتایا ہے۔ ایسا سمجھنا پورے قرآن کے انکار کے مترادف ہے؛ اس لیے کہ قرآن میں جا بجا مشرکین وکفار کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ دوزخ میں جائیں گے: {وَلِلْكَافِرِينَ عَذَابٌ مُهِينٌ} [البقرۃ: ۹۰]، ”کافر لوگ ذلت آمیز سزا کے مستحق ہیں“۔

بلکہ ایک جگہ حضور ﷺ سے بھی کہا گیا کہ وہ اعلان کر دیں کہ کفار دوزخ میں جائیں گے:
{قُلْ لِلَّذِينَ كَفَرُوا سَتُغْلَبُونَ وَتُحْشَرُونَ إِلَى جَهَنَّمَ وَبِئْسَ الْمِهَادُ} [آل عمران: ۱۲]۔ ”جن لوگوں نے کفر اپنا لیا ہے، ان

سے کہہ دو کہ تم مغلوب ہوگے اور تمھیں جمع کر کے جہنم کی طرف لے جایا جائے گا اور وہ بہت بُرا بچھونا ہے''۔

{إِنَّ اللَّهَ يَفْصِلُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ} کا مطلب:

اس آیت کا اصل مفہوم دوسری آیات کی روشنی میں صرف اتنا ہے کہ یہودی، صابئین، نصاریٰ، مجوس، مشرکین اور مسلمان سب اپنے اپنے تعلق سے حق پر ہونے کے مدعی ہیں۔ان میں سے جو باطل پر ہیں ان کو ہزار چاہنے کے باوجود بھی حق کا قائل نہیں کیا جاسکتا۔یہ کام تو خدا ہی کا ہے۔وہی قیامت کے دن ان سب کے درمیان فیصلہ کرے گا کہ کون حق پر ہے،اور کون باطل پر۔دنیا میں بڑے سے بڑا مناظرہ بھی اس بات کا فیصلہ نہیں کر سکتا اور نہ ہی اہل باطل کو حق بات ماننے پر مجبور کر سکتا ہے۔ہزاروں؛ بلکہ لاکھوں مناظروں کی تاریخ اس بات کی شاہد ہے۔

درحقیقت یہ آیت ان آیات کی قبیل سے ہے جن میں کہا گیا ہے کہ جب خدا کے پاس تم جاؤ گے، تو وہ تمھیں ان تمام باتوں کے تعلق سے آگاہ کر دے گا جن میں تم اختلاف کرتے تھے۔ تو گویا قرآن اپنے ماننے والوں کو نصیحت کرتا ہے کہ ان کے چکر میں نہ پڑو۔ تم اپنا کام کرتے رہو،اور لوگوں کو حق کی طرف بلاتے رہو۔اگر یہ کٹ حجتی سے باز نہیں آتے، تو فیصلہ کرنے والے ہم ہیں، تو ہم انھیں بتادیں گے کہ حق کیا تھا اور باطل کیا۔اسی طرح اس میں اہل باطل کے لیے دھمکی بھی ہے۔

حوالہ جات

(۱) ادراک زوال امت: ۴۹۴/۲، بعنوان ربانی تصورِ حیات کی تشکیلِ نو

(۲) ادراک زوال امت: ۴۹۲/۲، بعنوان ربانی تصورِ حیات کی تشکیلِ نو

(۳) مجموعة الوثائق السياسية: ٦١

(۴) ادراک زوال امت: ۴۰۷/۲، بعنوان ربانی تصورِ حیات کی تشکیلِ نو

(۵) حوالۂ سابق: ۹۲/۱-۹۳، بعنوان: تفہیم زوال

(۶) حوالۂ سابق: ۷۴/۱-۷۵، بعنوان: تفہیم زوال

(۷) حوالۂ سابق: ۴۰۷/۲، بعنوان ربانی تصورِ حیات کی تشکیلِ نو

جاری.....

☆☆☆

اسلامی تحریکات

طالبان اور حماس کو سلام!

ادہم الشرقاوی/ترجمہ محمد صادر ندوی

(نوٹ: یہ ملحوظ رہے کہ صاحب تحریر نے مطلق خارجی قرض کی ادائیگی کا تذکرہ کیا ہے، جس سے یہ تاثر ملتا ہے کہ شاید اب افغانستان پر کسی طرح کا کوئی بین الاقوامی قرض نہیں ہے۔ حالاں کہ ۱ر فروری کا واقعہ Electricity debt سے متعلق ہے۔ مترجم)

طالبان کو زمام اقتدار سنبھالے ابھی محض ڈھائی سال گزرے ہیں، اس درمیان اس نے ایک بڑی میابی یہ حاصل کی کہ اپنے آپ کو بین الاقوامی قرض کے چنگل سے آزاد کرا لیا، جس کا اعلان اس نے دو (۱ر فروری ۲۰۲۴ء) روز قبل ہی کیا ہے، اس طرح اب وہ ہر طرح کے غیر ملکی قرضوں سے آزاد حکومت کہلائے گی۔

مغربی اور عرب میڈیا کے ذریعہ صدیوں سے ہمارے ذہن ودماغ میں یہ تصویر بٹھائی گئی ہے کہ طالبان وحشی درندے ہیں، ان کی زندگی غاروں اور پہاڑیوں میں گزرتی ہے، سیاست، اقتصاد اور تعلیم کا انھیں ذرّہ برابر بھی شعور نہیں ہے، نہ ہی ان کے پاس سوچنے سمجھنے کے لیے عقل ہے، وہ صرف بندوق کی نالیوں سے بات کرتے ہیں۔ مغربی میڈیا اور اس کے ہم نواؤوں کی اس بے بنیاد اور غلط تصویر کشی کے ساتھ یہ بھی ضروری قرار پایا کہ آپ ان کے ہر بیانیہ کو سچا سمجھیں، چاہے اس کی حقیقت چائے کے کپ میں بسکٹ کے ایک ٹکڑے کی مانند کیوں نہ ہو، ورنہ آپ بھی دہشت گردوں کی لسٹ میں شامل ہو جائیں گے۔ وہ (استعماری طاقتیں) ترقی یافتہ ہیں، ان کے پاس جدید دنیا کے لیے ایک نیا پیغام ہے، اس لیے انھیں یہ حق پہونچتا ہے کہ جس ملک پر چاہیں قبضہ کرلیں، وہاں کی حکومت کو استعمار کے قدموں تلے روند دیں، شہریوں کا قتل عام کر کے انھیں اپنے ہی گھروں سے کھدیڑ دیں، اور پھر ملک کی مکمل ثروت پر قبضہ کر کے وہاں ایسی حکومت کو قائم کریں جو ان کے مقاصد کو بروئے کار لانے میں ان کا تعاون کرے۔ انھیں تو یہ حق حاصل ہے؛ لیکن جو جماعت اپنی سرزمین، مال وجائداد اور عزت وآبرو کی حفاظت کے لیے بندوق اٹھائے، وہ دہشت گرد اور وحشی درندہ ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ مغرب کو کبھی مسجد سے خوف نہیں ہوا، اگر ہر گھر کی چھت پر ایک مسجد تعمیر کر دی جائے؛ تب بھی اسے کوئی خدشہ نہیں۔ اصل خطرہ اس بات سے ہے کہ اسلام کے ہاتھ میں اقتدار نہ آجائے؛ کیوں کہ جو مسلمان اس وقت بکھرے ہوئے ریوڑ کی مانند ہیں، اقتدار آنے کے بعد دنیا کے اسٹیج پر ان کی پوزیشن بدل جائے گی، ان کے پاس دشمن کا ترکی بہ ترکی جواب دینے کی سکت ہوگی۔

اسلام کو جب بھی اپنے حکیمانہ، عادلانہ اور قرآن وسنت پر مبنی قوانین کے ذریعے حکومت کا موقع ملتا ہے تو وہ حیرت

انگیز کارنامے انجام دیتا ہے۔اس کو سمجھنے کے لیے آپ آج کے افغانستان کی معیشت کا مطالعہ کر سکتے ہیں، جس نے اپنے اوپر سے قرض کا بوجھ اتار دیا ہے اور عالمی بنک کے دستاویز(Parchment) کو پھاڑ کر پھینک دیا ہے۔اور دوسری طرف آپ مصر، اردن، لبنان، شام اور عراق کی معیشت کو بھی دیکھ سکتے ہیں، کہ کس طرح یہ ممالک دن بدن قرض کے بوجھ تلے دبے جارہے ہیں۔آج وہ مصر بھی مقروض ہے، جس کی شان یہ تھی کہ حضرت یوسفؑ کے زمانے میں تن تنہا پوری دنیا کو شکم سیر کرتی تھی، لوگوں کو ان کی من پسند غذائیں میسر تھیں۔مصر کے اندر آج بھی یہ خاصیت موجود ہے کہ اگر صرف ڈیلٹائی علاقے میں گیہوں کی کھیتی کی جائے تو مصر فقط بالیوں کی کثرت سے دنیا کی سب سے بڑی قوت بن جائے۔

ہمارے پاس وسائل کی کبھی کمی نہیں رہی، الحمد للہ وسائل اور ذرائع کے حساب سے مسلم ممالک ہمیشہ سے ممتاز رہے ہیں؛ لیکن ہمارے درمیان سے تنظیم اور ارادہ کا فقدان ہے۔یہاں ایسے ملک کی بات نہیں ہو رہی ہے، جہاں مسلمان، اس کے شہری کی حیثیت سے رہتے ہیں، اور جس کے قوانین اجنبی، جس کا پرچم قیدی اور جس کی معیشت ورلڈ بنک کی غلامی کی زنجیروں سے مربوط ہے؛ بلکہ ایسے ملک کی بات ہو رہی ہے، جہاں عملاً اسلام ہی کے نام پر حکمرانی ہوتی ہے۔

دین دار طبقے کے بارے میں مصری ڈرامے نے ہمیں یہ دکھایا کہ وہ محض مٹھی بھر، عقل سے عاری دہشت گردوں کی جماعت ہے۔عادل امام نے دین داری اور رجعت پسندی کو ایک ہی سکہ کے دو رخ قرار دے کر اور ہمارے ذہن و دماغ میں دین داری کی بھدی سی شکل بٹھا کر ہمیں خوب خوب ہنسایا۔پھر شامی ڈرامے میں ہمیں یہ باور کرایا گیا کہ دین دار لوگ، درویش اور متبرک لوگ ہوتے ہیں، البتہ ان کا مثالی مقام و مرتبہ محض حجروں اور خانقاہوں تک محدود ہے۔حکومت سے انھیں کوئی لینا دینا نہیں، اس کے لیے دوسرے افراد ہیں۔اسی سوچ کو لے کر صدیاں گزر گئیں! ہم نے اسلام کو حکومت و سلطنت سے دور رکھا، نتیجہ کیا نکلا؟ ہم سرخرو ہو گئے؟ نہیں! الٹا یہ ہوا کہ معاشی، تعلیمی اور عسکری ہر میدان میں پیچھے ہو گئے۔

غزہ میں حماس کا تجربہ اسلام کی قوت حکمرانی کے سلسلے میں دوسرا حیرت انگیز تجربہ ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جب جب اسلام کو حکمرانی کا موقع ملتا ہے تو وہ کیا کیا کر دکھانے کی قوت رکھتا ہے۔

ہماری متحدہ قوت صہیونی طاقت کے سامنے چھ گھنٹے سے زیادہ ٹھہر نہ سکی؛ جب کہ "القسام" دو سو دن سے اپنے قدموں پر کھڑا ہے، اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوا، حالاں کہ اس پر ایسے ہتھیاروں سے حملے کیے جا چکے ہیں، جن سے صرف حکومتیں ہی نہیں ٹوٹتی، بلکہ بڑی بڑی شہنشاہیت بھی زمیں بوس ہو جاتی ہے۔

غزہ کے پاس اتنے وسائل نہیں ہیں، جتنے ہماری مسلم حکومتوں کے پاس ہیں، پٹرول، سونا، بندرگاہیں، ایئرپوٹ، ان میں سے کچھ بھی نہیں۔لیکن ہاں اس کے پاس صحیح دین اور سچا ارادہ ضرور ہے۔

صہیونی دفاعی فورسز(IDF) کو مرکاوا ٹنک پر ہمیشہ سے ناز تھا، اسے دنیا کا سب سے مضبوط ٹینک تصور کیا جاتا تھا اور اس نے عملاً کئی دہائیوں سے اس دنیا کے تمام اینٹی آرمر ہتھیاروں کا مقابلہ بھی کیا تھا، لیکن وہ جو لوگ جو برسوں سے محصور تھے، بنیادی ذرائع اور خام مال سے محروم بھی تھے، انھوں نے الیاسین ۱۰۵ اٹینک بنا کر مرکاوا کو تباہ کر دیا، اس کے چیتھڑے اڑا دیے۔

کیا ہمارے مسلم ممالک میں سے کوئی بھی ملک ایسا ہے، جو خود اپنے ہتھیار تیار کرتا ہو، حالاں کہ اس کے پاس وسائل کی فراوانی ہے۔ جواب ''کوئی بھی نہیں'' کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا! اس لیے نہیں کہ ہمارے پاس بنانے کی قوت نہیں ہے، بلکہ اس لیے نہیں بنا سکتے کہ یہ کام ہمارے لیے قانونی طور پر ممنوع ہے۔ ہر اس چیز کی طرف ہاتھ بڑھانا ممنوع ہے، جس سے طاقت کا معیار بدل سکتا ہے۔ آپ کو ہمیشہ مرہون منت بن کر ہی رہنا ہے، ہتھیار خریدو، لیکن استعمال کی اجازت نہیں۔

اس کے ساتھ آپ پر یہ بھی فرض ہے کہ آپ مانیں کہ اسلام حکومت واقتدار کرنے کے لیے بالکل غیر مناسب ہے۔ اور یہ لوگ جو گیم کے اصولوں کو بدلنا چاہتے ہیں، ان کی حیثیت پس ماندہ اور دہشت گردوں سے زیادہ کچھ نہیں، ہمارا ملک بدحالی کی جس انتہا پر پہنچ چکا ہے، اس کے ذمے دار یہی لوگ ہیں۔ اس طرح وہ خود اسلام کو اقتدار سے دور کر کے اہل اسلام ہی کو اپنی ناکامی کا تمغہ عطا کرتے ہیں۔

طالبان نے صرف ڈھائی سال کے اندر معجزہ کر دکھایا، جب کہ ہمارے گرد رائج نظام صدیوں سے مالی مشکلات کا سامنا کر رہے ہیں۔ حماس نے ایک چھوٹے سے محصور علاقے میں رہ کر ایسا عسکری کارنامہ انجام دیا اور ایمان ویقین اور صبر و استقامت سے لبریز مقاومہ کی ایسی عظیم مثال پیش کی ہے، جس نے دنیا کو حیران کرنے سے پہلے ہمیں حیران کر دیا۔ یہ اصلاً اس عظیم اسلام کا کارنامہ ہے، جس کو جب کبھی اقتدار ملتا ہے تو انوکھی مثال قائم کرتا ہے۔

اے اللہ تو اپنے نام لیواؤں کی مدد فرما اور مجاہدین کو جلد فتح ونصرت سے سرفراز فرما۔ آمین!

☆☆☆

(بقیہ ص: ۴۵ کا) ان حضرات کی قربانیوں اور علمی کاوشوں کی بدولت آج یہ ادارہ نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیائے اسلام اور یورپ کے ملکوں میں بھی بڑی شہرت ومقبولیت کا حامل ہے، جہاں اس ادارے میں ہندوستان کی اہم سیاسی شخصیات پنڈت جواہر لال نہرو، مہاتما گاندھی کی آمد رہتی تھی، وہیں دوسری طرف وقتاً فوقتاً یورپ کے اہل قلم اور اسکالر یہاں پر تشریف لاتے رہتے تھے، اور آج بھی یہ سلسلہ جاری ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس ادارے کی علمی خدمات سے مکمل واقفیت کے بعد یہ اندازہ ہو گا کہ دار المصنفین نے ایسے ایسے گنجینہ وجواہر دیے، ایسی نادر ونایاب موتیاں دیں کہ تلاش بسیار کے بعد بھی نہیں مل سکتیں۔

مگر افسوس آج مسلم قوم کی بے حسی وبے اعتنائی ہر کہ گزشتہ چند سالوں میں اسکی جو قدر ومنزلت ہونی چاہیے وہ نہ ہو سکی، ذرائع اور وسائل کے اعتبار سے جو اس کی معاونت ہونی چاہیے تھی وہ نہ ہو سکی، یہی بے حسی وبے اعتنائی بڑے بڑے اداروں کو برباد کر دیتی ہے، آج یہ ادارہ صرف اور صرف اپنے وژن اپنے جذبہ و اخلاص کی وجہ سے زندہ ہے، جو رفقائے دار المصنفین کے دل ودماغ میں پیوست ہے، اور ان کی رگوں میں لہو بن کر دوڑ رہا ہے، خدا کرے یہ ادارہ اسی طرح پورے اخلاص کے ساتھ علمی برگ وبار لاتا رہے اور شبلی کے خواب و خیال میں حسن تعبیر کا رنگ بھرتا رہے۔

☆☆☆

تعارف و تبصرہ

تبصرہ نگار: ڈاکٹر محمد طارق ایوبی

نام کتاب	:	رسول اللہ ﷺ شعبِ ابی طالب میں (ایک تاریخی مطالعہ) (۱)
مصنف	:	ڈاکٹر محمد مشتاق تجاروی
صفحات	:	۲۱۶
قیمت	:	۳۰۰/روپے
ناشر	:	ہدیٰ پبلشنگ ہاؤس
رابطہ	:	9910702673-muftimushtak@gmail.com

زیرِ نظر کتاب سیرتِ طیبہ کے موضوعی مطالعہ کا ایک شاہکار ہے، علم و تحقیق، ذوق و کاوش کی عمدہ مثال ہے، ہمارے عہد کی سہل پسندی اور سہل انگاری کے ماحول میں قلمی و تحقیقی کاوشوں کے لیے نمونہ و معیار ہے۔ اس کا طرزِ تحقیق اور اسلوبِ نگارش علمی ہے، بقدرِ ضرورت الفاظ استعمال کیے گئے ہیں، سیرت کا موضوع ہو، مسلمان کا قلم ہو، وہ بھی متدین عالم کا اور علمی اسلوب پر ایسی توجہ مرکوز ہو کہ لفاظی اور جذباتیت ظاہر کرنے والی کوئی تعبیر نہ در آئے یہ از خود مصنف کا کمال، کتاب کی سب سے بڑی خصوصیت اور پختہ علم و قلم کی دلیل ہے۔ اردو میں سیرت یا تفسیر میں موضوعی مطالعہ کی روایت بہت عام نہیں ہے، جبکہ عربی میں اس منہج پر بہت پہلے توجہ دی گئی اور بڑی اچھوتی کتابیں منظر عام پر آئیں، ایک ایک پہلو کو موضوع بنا کر شاندار کتابیں تصنیف کی گئیں، تفسیر موضوعی ہو یا سیرت کا موضوعی مطالعہ عربی کا مکتبہ اس سے مالا مال ہے، اردو میں سیرت کے موضوعی مطالعہ کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو چند ایک نام ہی نظر آئیں گے، جن میں نمایاں ترین نام ڈاکٹر محمد حمید اللہ اور ندوہ کے لائق فخر فرزند اور علی گڑھ کے مایہ ناز استاد پروفیسر ڈاکٹر یٰسین مظہر صدیقی رحمہما اللہ ہیں۔ ڈاکٹر محمد مشتاق تجاروی بیسویں صدی کے اسی لائق فخرِ سیرت نگار کے تربیت یافتہ، بلکہ یُوں کہیے کہ ان ہی کے ذوقِ تحقیق اور اسلوبِ نگارش کے مقلد و اسیر ہیں، ہمارے عہد میں وہ علم و تحقیق اور قلم کی آبرو ہیں، ان کے نام سے واقفیت تھی، ان کی علم دوستی کے بارے میں سن رکھا تھا، ان کے بارے میں معلوم تھا کہ وہ انتہائی خوش خلق، متواضع اور علم دوست، صاحبِ ذوق اور سادہ مزاج و بے تکلف عالم ہیں۔ وہ خود تو مصنف ہیں ہی، مگر ان کا کمال یہ ہے کہ وہ دوسروں کو بھی مصنف بنا دیتے ہیں۔ گذشتہ دنوں میوات کے سفر میں ان سے ملاقات ہوئی، کانوں نے ان کے بارے میں جو سنا تھا، آنکھوں نے تواضع اور خورد نوازی کا اس سے بڑھ کر مشاہدہ کیا، اسی ملاقات میں انھوں نے اپنی یہ تازہ تحقیقی کاوش عطا کی۔

شعبِ ابی طالب کا محاصرہ سیرت نبوی کا ایک اہم باب ہے، اسلامی تحریک کے ابتدائی عہد پر اس کے بڑے دور رس اثرات پڑے ہیں، لیکن یہ واقعہ ہے کہ کتبِ سیرت میں اس تین سالہ محاصرہ پر تفصیل سے گفتگو نہیں کی گئی، بقول مصنف بعض

سیرت نگاروں نے تو اپنی کتاب میں اس تین سالہ محاصرہ کی تفصیلات کے لیے تین صفحات بھی خاص نہیں کیے ہیں۔اس پسِ منظر میں اس کتاب کی اہمیت دو چند ہو جاتی ہے، کیوں کہ یہ کتاب تفصیل سے سیرتِ طیبہ کے اس تین سالہ عہد کی تفصیلات پیش کرتی ہے،اس عہد کی تحریکی ودعوتی سرگرمیوں اوراس بائیکاٹ کے نتائج واثرات پر بھی روشنی ڈالتی ہے۔

اس کتاب کی اہمیت اس لیے بھی بہت زیادہ ہے، کیوں کہ یہ ایک ایسے عہد میں منظر عام پر آئی ہے،جب کہ ہر طرف مسلمان حالات کارونارورہے ہیں،اغیار ان کے خلاف جمع ہیں، سیاسی سطح پر تقریباًان کو حاشیہ پر ڈال دیا گیا ہے، وطنِ عزیز میں تقریباً انھیں بائیکاٹ کی سی صورت حال کا سامنا ہے،اہلِ غزہ تو بالکل اسی صورت حال سے گذررہے ہیں، گھاس پھوس پر گزارا کر رہے ہیں، بالکل وہی صورت حال ہے، وہاں بھی امداد کا پہنچنا دشوار بنادیا گیا تھااور یہاں بھی انسانی امداد کو روک دیا گیا ہے، بلکہ وہاں تو مظالم ڈھانے والے سب کفار تھے، یہاں ۵۷ مسلم ممالک کے ہوتے ہوئے مقاطعہ کا سامنا ہے اور کھانا پانی تک پہنچنا محال ہے، اس صورت حال میں یہ کتاب اس لیے اہم ہے کہ ایک طبقہ یہ سمجھتا ہے کہ یہ حالات نئے ہیں، پہلی مرتبہ امت کو ایسی آزمائش کا سامنا ہے، بلکہ یہی سوچ بہت سے لوگوں کو رفتہ رفتہ الحاد تک پہنچاتی ہے۔یہ کتاب اس پہلو سے بڑی اہم ہے کہ یہ عہدِ نبوی کی اس زبردست ودل خراش آزمائش کا حال سناتی ہے، پھر اس دور میں نبی کی حکمتِ عملی اور اس کے اثرات سے واقف کراتی ہی اور اس طرح امت کو راہِ عمل دکھاتی ہے۔ذرا دیکھیے کتاب کے آٹھویں باب میں ”محاصرہ شعبِ ابی طالب کے اثرات“ پر گفتگو کی گئی ہے،اس ضمن میں مصنف نے نتائج تحقیق کو تین ذیلی عناوین میں بیان کیا ہے:

(الف) قبائلِ عرب میں اسلام کا چرچا۔

(ب) مشرکین میں مسلمانوں کے حامی پیدا ہو گئے۔

(ج) مسلمانوں کی قوت کا اعتراف کیا گیا۔

اب ذرا سیرتِ نبوی کے اس عہد کی یہ تاریخ اور اس کے اثرات کو پڑھنے کے بعد اس تاریخ کو معاصر حالات کے تناظر میں یا حالات کو تاریخ کے آئینے میں دیکھیے۔آج کی صورت حال سے جوڑ کر Relate کر کے دیکھیے۔قنوطیت پسندوں اور منکرین جہاد نے طوفانِ اقصیٰ کے بعد بہت واویلا کیا، شہادتوں کا مرثیہ پڑھنے لگے، غزہ کی صورت حال کا ماتم کرنے لگے، نقصانات شمار کرانے لگے اور سب کا ذمہ دار مجاہدین اقصیٰ کو ٹھہرانے لگے، لیکن کیا یہ واقعہ نہیں کہ یورپ میں اسلام کے چرچے میں اضافہ ہوا،اہلِ غزہ کے صبر واستقامت اور کفاح وجہاد نے لوگوں میں ان کی روحانی قوت کا راز جاننے کا جذبہ جگادیا، لوگ قرآن کا مطالعہ کرنے پر آمادہ ہوئے، اور کیا یہ واقعہ نہیں کہ مغربی حکمرانوں کی صہیونیت نوازی اور حکمِ زباں بندی کے باوجود پورے یورپ میں فلسطین کو زبردست حمایت حاصل ہوئی، عوام کھل کر اہلِ غزہ کی حمایت میں مظاہرے کرنے لگے، جیل جانے اور اپنے حکمرانوں کا ظلم سہنے سے بھی گریز نہ کیا، کیا یہ تاریخی حقیقت نہیں کہ مسلم ممالک کی بے حسی کے باوجود اسرائیل کے انسانیت سوز مظالم کا مقدمہ لے کر ساؤتھ افریقہ عالمی عدالت پہنچ گیا اور پھر اس سے کون انکار کرے گا کہ اس واقعہ نے عالمی سطح پر حماس اور اہلِ غزہ کی ایمانی طاقت کو تسلیم کرایا، جو لوگ طاقت کے عدمِ توازن کا رونا رورہے تھے، وہ بھی کھلی آنکھوں مشاہدہ کر رہے ہیں کہ اسرائیل کی طاقت کا بھرم ٹوٹ گیا، اس کی اسلحہ منڈی پھیکی پڑ گئی، اس کے سیکورٹی سسٹم کی ہوا نکل گئی، عالمی

سیاست پر حماس کی سیاست کے اثرات محسوس کیے جارہے ہیں، مغرب اپنی سیاسی پالیسی پر از سرِ نو غور کرنے پر مجبور ہو رہا ہے۔

یہ کتاب مقدمہ و تمہید کے علاوہ ۹ ابواب اور ایک ضمیمہ پر مشتمل ہے، محاصرہ شعبِ ابی طالب کے ایک ایک جزئیہ کی تحقیق کے ساتھ دستیاب تفصیلات کو مرتب و منظم انداز میں پیش کرنے کی خوب صورت کوشش کی گئی ہے۔ مصنف نے اس کی تیاری کے لیے درجنوں عربی مصادر، بنیادی ماخذ اور اردو کتب کا مطالعہ کیا ہے، سیرت و حدیث و تاریخ کی بنیادی کتب اور کلامِ عرب کا تتبع کر کے مرتب و منقح مطالعہ پیش کیا ہے، بلکہ امت کو اس کا منصب و مقام اور کام بھی یاد دلایا ہے، ''ایّامِ مقاطعہ کے احوال'' اس کتاب کا پانچواں باب ہے، اس کے تحت ایّامِ محاصرہ کی حکمتِ عملی پر گفتگو کرتے ہوئے جو پہلا نکتہ بیان کیا گیا ہے، وہ بہت اہم ہے۔ مصنف محترم لکھتے ہیں:

''اللہ کے رسول ﷺ کا منصب دینِ حق کی اشاعت کرنا تھا۔ اللہ پاک نے اسی کام کے لیے آپ کو مبعوث فرمایا تھا۔ اس لیے چاہے شعب کا محاصرہ ہو یا کوئی میدانِ جنگ ہو یا پھر کوئی دوسری صورتِ حال ہو، دعوتِ دین کا کام تو رسول اللہ ﷺ کو ہر جگہ ہی کرنا تھا۔ چناں چہ محاصرہ کے ان ایام میں بھی دعوتی کام برابر جاری رہا۔ ساتھ ہی رسول اللہ ﷺ اس دوران میں پیش آنے والے دیگر مسائل کو بھی حل کرنے کی کوشش کرتے رہے، چوں کہ یہ معاشی اور سماجی مقاطعہ تھا، اس لیے اس کا مقابلہ کرنے کے لیے رسول اللہ ﷺ نے ایک طبقہ کو مکہ سے باہر حبشہ بھیج دیا۔ پھر حبشہ کے بادشاہ کے ساتھ سفارتی تعلقات استوار کیے۔ اس کے ساتھ ساتھ مشرکین سے بحث و مباحثہ بھی جاری رہا اور اس حوالے سے قرآن مجید کی آیات و سورتیں بھی نازل ہوتی رہیں۔ ذیل کے صفحات میں ایامِ شعب کے دوران میں رسول اللہ ﷺ کے بعض واقعات اور آپ ﷺ کی حکمتِ عملی کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں........۔

رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کا ایک بنیادی مقصد دعوت و ارشاد تھا۔ آپ ﷺ ساری زندگی اس کام میں مصروف رہے، ایامِ مقاطعہ میں بھی آپ کی دعوتی کاوشیں برابر جاری رہیں۔ سیرت کی تمام کتابوں میں اس دور کی دعوتی سرگرمیوں کا ذکر ہے۔...۔ شعبِ ابی طالب کے مقاطعہ کا ایک مثبت پہلو یہ ہے کہ اس کی وجہ سے عام عرب اسلام سے واقف ہوئے اور مسلمانوں کی جاں بازی اور مشرکین کے اس ظلم و جبر کی وجہ سے وہ اسلام کے بارے میں جاننے کی کوشش کرنے لگے۔ خاص طور پر ایامِ حج میں جب باہر کے لوگ مکہ آتے تو اس مقاطعہ کی وجہ سے وہ اسلام کے نام اور اسلام کی دعوت سے واقف ہوتے، اس طرح شعب کی محصوری اسلام کی دعوت اور اسلام کی اشاعت کا ذریعہ بنی۔ یہ بات صرف شعب کے اس ایک واقعہ تک منحصر نہیں ہے۔ بلکہ تاریخ میں جب جب اسلام کے خلاف گھیرابندی کی گئی اور مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کیا گیا، اس کے بعد ہمیشہ اسلام کو ہی سربلندی ملی اور اسلام کو مٹانے کی کوشش کرنے والے خود ہی ہمیشہ کے لیے منصۂ شہود سے مٹ گئے۔ دعوتی سرگرمیوں کے علاوہ شعب کی محصوری کے ایام میں ایک فائدہ یہ ہوا کہ اس دوران میں دعوت کے لیے ماحول اور فضا سازگار ہوئی، اس لیے کہ مشرکین نے مسلمانوں کے ساتھ جو غیر انسانی رویّہ اختیار کیا تھا، اس نے خود قریش کے اندر اور عرب کے بقیہ خطوں میں سعید روحوں کا ضمیر جھنجھوڑ دیا تھا۔ لوگ اسلام کے بارے میں بھی مثبت انداز میں بات کرنے لگے تھے اور

مسلمانوں سے یک گونہ ہمدردی توسب کو ہوگئی تھی۔" (کتاب ہذا، ص: ۱۰۴-۱۰۶)۔

سیرتِ طیبہ کے موضوعی مطالعہ سے متعلق اس اہم کتاب کی اشاعت پر ہم ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہیں، اہلِ علم کے لیے یہ تصنیف گراں قدر تحفہ ہے، اصحابِ دعوت کے لیے مشعلِ راہ اور اہلِ عزیمت کے لیے زادِ سفر ہے۔ امید ہے کہ علمی و دعوتی حلقوں میں اس کی شایانِ شان پذیرائی ہوگی۔

---

(۲)

نام کتاب : مولانا محمد حبیب الرحمٰن خاں شروانیؒ کی دینی و علمی خدمات - کچھ اہم پہلو
مصنف : پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی
صفحات : ۱۷۶
ناشر : مصنف
ملنے کے پتے: دارالمصنفین، شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ

نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی (۱۸۶۷ء- ۱۹۵۰ء) کا شمار برصغیر کی ان شخصیات میں ہوتا ہے، جنھوں نے تاریخ میں اپنے گہرے نقوش و آثار چھوڑے، ایک زمانے کو متاثر کیا، مر کر بھی تاریخ میں زندہ رہے۔ مولانا شروانی کا علم اور ملت سے رشتہ اس قدر گہرا تھا کہ اسلامیانِ ہند کی علمی تاریخ ہو یا ملی تحریکات کی تاریخ، دونوں ان کے ذکرِ خیر کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتیں۔ مولانا شروانی کی زندگی کا بڑا حصہ ملت کی خدمت، علم و علماء کی خدمت اور سماج کی تعمیر و ترقی میں لگا۔ یہ واقعہ ہے کہ مولانا شروانی پر جس قدر کام ہونا چاہیے تھا اور جس طرح ان کا تذکرہ کیا جانا چاہیے تھا، وہ اب تک نہیں ہوا، ۲۰۰۸ء میں ہمارے ادارے میں مولانا شروانیؒ اور مفتی لطف اللہ علی گڑھیؒ پر ایک مشترکہ سیمینار کے انعقاد کا فیصلہ کیا گیا تھا، دعوت نامے ارسال کر دیے گئے تھے، پروفیسر ریاض الرحمٰنؒ صاحب کو کلیدی خطبہ کے لیے راضی کر لیا گیا تھا، بلکہ وہ میزبانی میں بھی شریک ہو گئے تھے، لیکن کچھ ناگزیر اسباب کی بنا پر اُسے ملتوی کرنا پڑا اور وہ التوا بھی ایسا ہوا کہ پھر اس کی نوبت نہ آسکی۔ چند برس قبل مرحوم اخلاق شروانی صاحب کی کتاب آئی، جس میں انھوں نے مولانا شروانی پر اساطینِ علم اور اربابِ نظر کے مضامین کو مختلف کتابوں سے جمع کر دیا تھا، اس کی تقریب اجراء میں مجھے بھی تبصرہ کی دعوت موصول ہوئی۔ اس تبصرہ میں راقم نے مولانا کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں اور لائقِ تقلید گوشوں پر گفتگو کرتے ہوئے مجلس میں موجود مدیح الرحمٰن شروانی صاحب کی توجہ اس سیمینار اور مولانا پر مزید کام کی طرف مبذول کرائی، خدا خدا کر کے شعبۂ عربی میں ایک سیمینار منعقد ہوا، اس دوران کچھ اور بھی اس سلسلے کے کام منظرِ عام پر آئے۔

مولانا شروانی ایک ریاست کے امیر تھے، لیکن ایسے باذوق امیر کہ نادر کتب کا بڑا ذخیرہ جمع کیا، علم دوست ایسے کہ اصحابِ علم و فضل ان کی طرف کھنچے چلے آتے، صاحبِ قلم ایسے کہ ان کے مقالات کی معنویت آج بھی محسوس کی جاتی، صاحبِ فضل ایسے کہ آج بھی ان کی سخاوت کے قصے سنے جاتے ہیں۔ ان کی شخصیت کا یہ پہلو بڑا تابناک ہے کہ وہ اپنے زمانے کی ہر ملی کوشش سے گہرا ربط رکھتے تھے اور اس کے معاون ہوتے تھے، سرسید کی تحریک ہو، یا دیوبند کا مدرسہ یا تحریک ندوۃ العلماء یا اعظم

گڑھ کا بیت الحکمہ، مولانا شروانی کی نمایاں شرکت ہر جگہ نظر آتی ہے، صحیح بات یہ ہے کہ ان کی شخصیت کا جو نقشہ مولانا علی میاںؒ نے اپنے مضمون کے ایک پیرا گراف میں کھینچا ہے، وہ بڑا حسین و دل کش اور انتہائی جامع ہے، مختلف الجہات و جامع کمالات شخصیت کا مرقع پیش کرنے کے لیے ایسے ہی قلم کی ضرورت ہوتی ہے، جو چند سطروں میں پوری تصویر پیش کر دے، مولانا علی میاںؒ کا یہ پیرا گراف اِس کی عمدہ ترین مثال ہے۔

''میں نے اپنے طویل سفروں اور لوگوں سے تعلقات میں ہر طرح کے اہل کمال دیکھے ہیں، میں نے اہلِ علم کو بھی دیکھا ہے، اہلِ دین کو بھی دیکھا، ادیبوں اور شاعروں سے بھی ملا، لیکن میں نے ان جیسا متضاد صفات کا جامع اور متنوع شخصیت کا حامل نہیں دیکھا، وہ حلقۂ امراء میں امیر، دبستانِ ادباء میں ادیب، طبقۂ شعراء میں شاعر، مصنفین کی دنیا میں مصنف، ناقدوں کی صف میں ناقد و مبصر اور ماہرین تعلیم کی محفل میں ایک ماہرِ تعلیم تھے اور جب کسی مجلس میں یہ سب جمع ہوتے تو وہ صدر محفل اور شمع انجمن ہوتے اور لوگ پروانہ وار انھیں گھیر لیتے، ان سے رجوع کرتے اور میرِ مجلس بناتے۔'' (پرانے چراغ، مولانا سید ابو الحسن علی ندوی، ص:۲۷- ۲۸)۔

زیرِ نظر کتاب اسی جامع کمالات شخصیت کے بعض پہلوؤں کو پیش کرتی ہے، مصنف گرامی پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی خود ایک مخلص صاحبِ قلم ہیں، عرصہ پہلے سبک دوش ہو چکے، لیکن ان کے قلم سے مسلسل تعمیری ادب کی آبیاری ہو رہی ہے۔ مفید کتابیں نکل رہی ہیں اور ان کا فیضان اسی رفتار سے آج بھی جاری ہے، سچی بات یہ ہے کہ مولانا شروانی پر یہ کتاب مدتوں بعد ایک مکمل کتاب کی شکل میں آئی ہے۔ یہ پانچ ابواب اور دو ضمیموں پر مشتمل ہے، ابتدا میں سوانحی خاکہ درج ہے، پہلے باب میں مولانا شروانی کے قرآن سے تعلق پر مدلل گفتگو کی گئی ہے اور یہ ثابت کیا گیا ہے کہ نہ صرف مولانا کو قرآن کی قرأت و تلاوت سے شغف تھا، بلکہ علوم القرآن، تفسیری نکات و متعلقاتِ قرآن پر ان کی گہری نظر بھی تھی، علمی و روحانی شغف کے علاوہ قرآن کریم کی تعلیمات کے اثرات ان کی زندگی میں نمایاں تھے، ان کا تقویٰ مسلم تھا، انھوں نے ریاستِ حیدر آباد کی پیشکش بھی اپنے دینی جذبہ کے تحت اور آخرت کی جواب دہی کے استحضار کے سبب ہی قبول کی تھی۔ کتاب کا دوسرا باب مولانا کے سیرتِ نبویؐ سے شغف پر روشنی ڈالتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جس کو قرآن مجید سے تعلق خاطر ہو گا، اس کے صاحبِ قرآن کی ذاتِ گرامی سے اُنس و شغف اور محبت میں کیا شبہ۔ در حقیقت قرآن و سیرت، اسلامی ثقافت بلکہ اسلامیت و مشرقیت کے وہ دلدادہ تھے، ان کی قلمی زندگی کے یہی موضوعات تھے، وہ نبیؐ کے عشق کا اظہار کردار و عمل سے کرنے کے نظریہ رکھتے تھے، مصنف محترم نے اس پہلو سے ان کی شخصیت کی اچھی تصویر کشی کی ہے۔

مولانا شروانی کی زندگی کا ایک بڑا کارنامہ کتب خانہ حبیب گنج کا قیام اور انتظام و انصرام تھا، اس حوالے سے مصنف نے ان کی علم نوازی، اہلِ علم سے دوستی اور ان کی علمی خدمت پر تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ تاریخ میں کم ہی ایسی مثالیں ملتی ہیں، ایک ریاست کا امیر جلیل القدر عالم بھی ہو اور اس پر مستزاد اپنے ہم عصر علماء کا خادم و قدر داں بھی۔ مولانا گیلانی کے بقول ان کا پیکر شاہانہ مگر دل فقیرانہ (ص:۷۱، کتاب ہذا) بلکہ انداز بھی درویشانہ تھا، انھیں امارت کا پندار تھا نہ علمیت کا غرّہ، کتاب کا یہ باب نہ

صرف لائقِ مطالعہ ہے، بلکہ آج کے اہلِ علم اور طلبہ کے لیے اس کا مطالعہ فائدہ سے خالی نہیں۔ یہ سطریں پڑھتے چلیے:

''اس بیش بہا مخزنِ کتب کے بارے میں نامور ادیب وار دو کے عظیم خادم پروفیسر رشید احمد صدیقی مرحوم کا یہ دل نشین تاثر بھی قابلِ نقل ہے: ''سوچنے اور فخر کرنے کی بات ہے کہ ایک شخص باوجود امارت، امیری اور شباب کی ترغیبوں کے جن سے لذت یاب ہونے کی آزادی نصیب تھی، مسلسل ساٹھ، ستّر سال تک اچھی کتابیں جمع کرتا رہا، تاکہ وہ ضائع نہ ہوں یا دوسروں کے قبضے میں نہ چلی جائیں اور اس طرح علم و فضل کے ناموروں کی میراث سے ان کے نام لیوا محروم نہ ہو جائیں۔''(شمس تبریز خاں، صدر یار جنگ، ص:۱۰۳، بحوالہ ضمیمہ مسلم یونیورسٹی گزٹ، ۲۴؍مئی ۱۹۶۱ء، ص ۲)۔

مولانا شروانی نے علم دوستی اور علمی خدمت کی بہت سی مثالیں چھوڑی ہیں، لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ کتب خانۂ حبیب گنج ان کی علمی خدمات کا ایسا روشن باب ہے جس کے نقوش آج بھی تابندہ ہیں اور اس کا فیض بدستور جاری ہے، ان شاء اللہ تعالیٰ آئندہ بھی جاری رہے گا۔ کسی نے لکھا ہے اور صحیح لکھا ہے:

''ہندوستان کے طول و عرض میں ذاتی کتب خانوں میں شاید ہی کوئی کتاب خانہ ایسا ہو جو حبیب گنج کے اِس کتب خانہ کی ہمسری کا دعویٰ کرسکے۔ میرا خیال ہے کہ اگر نواب صاحب ساری عمر میں ملک و ملت کی یا علم و فن کی کوئی خدمت نہ کرتے اور صرف یہ کتب خانہ قائم کردیتے، تو یہ اتنا عظیم الشان کارنامہ تھا کہ قوم ان کے شکریہ سے عہدہ برآ نہیں ہوسکتی تھی۔'' (ص: ۱۰۷-۱۰۸، کتاب ہذا)۔

چوتھے باب میں ''سرسید کی یاد'' کے عنوان سے کی گئی مولانا کی ایک تقریر اور اس کا تعارف و تجزیہ پیش کیا گیا ہے، سرسید سے مولانا شروانی بہت متاثر تھے، ان کی تعلیمی جدوجہد اور کالج سے ان کا گہرا تعلق تھا، وہ سرسید کے مداح اور قدرداں تھے۔ یہ خطبہ جو انھوں نے رام پور میں ۱۹۳۵ء میں سرسید ڈے کے موقع پر پیش کیا تھا، اس میں سرسید کے تعلیمی، تصنیفی، ادبی اور ملی کارناموں پر بہت جامع اور سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔ اس تقریر میں انھوں نے سرسید کے افکار کو تازہ کرنے، ان کی تعلیمی تحریک سے جڑے رہنے اور تعلق کو زندہ کرنے اور ان کی جدجہد کو نمونہ بنانے کے لیے ان کی یاد منانے کا جواز پیش کیا۔

آخری باب میں مولانا شروانی کے ایک نادر مضمون ''علی گڑھ کے مردانِ کار'' کا متن پیش کیا گیا ہے اور متن سے پہلے مصنف نے تمہیدی گفتگو کی ہے اور مضمون کے اہم پہلوؤں کو نکات کی شکل میں واضح کیا ہے، آخر میں دو ضمیمے ہیں۔ پہلے ضمیمہ میں مولانا شروانی کے معارف میں شائع شدہ مضامین اور پھر ان پر لکھے گئے مضامین کا اشاریہ ہے۔ دوسرے ضمیمہ میں یحیٰ اعظمی کا منظوم خراجِ عقیدت بعنوان ''ماتم حبیب شبلی'' شامل کیا گیا ہے۔

مختصر یہ کہ مولانا شروانی کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے یہ کتاب نہایت موزوں ہے، ان کی شخصیت کے پُرکشش پہلوؤں، قرآن وسیرت سے ان کے شغف، ریاستِ علم کی سربراہی، اقلیمِ قلم کی سلطانی، تقویٰ و تدین، علم دوستی و علم نوازی کو بڑی خوب صورتی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ اہلِ علم بالخصوص نئی نسل کے لیے یہ کتاب پروفیسر اصلاحی کی طرف سے ایک قیمتی تحفہ ہے۔

☆☆☆

آخری صفحہ

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایک انٹرویو

حضرت عمر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک دن عجیب وغریب واقعہ پیش آیا۔ ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے کہ دور سے ایک آدمی آتا ہوا دکھائی دیا، قریب آیا تو پتہ چلا کہ اس کے کپڑے سفید اور بالکل صاف ستھرے تھے، بال بالکل کالے سیاہ اور چمکدار تھے۔ اسے دیکھ کر کہیں سے بھی نہیں لگ رہا تھا کہ سفر سے آیا ہو، ایسا کوئی نشان بھی نہ تھا کہ جس سے پہچان ہو کہ وہ کوئی مسافر ہے، اور عجیب بات یہ تھی کہ ہم لوگوں میں سے کوئی اُسے جاننے والا بھی نہ تھا۔ وہ آتے ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھٹنوں سے گھٹنے ملا کر بیٹھ گیا اور اپنے دونوں ہاتھ اپنی رانوں پر رکھ لیے۔ گویا کوئی سلیقہ کا پُرانا شاگرد ہو۔ اب یہاں سے سیکھنے سکھانے کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ پوچھنے لگا: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مجھے اسلام کے بارے میں کچھ بتلائیے؟ اس کی حقیقت کیا ہے؟ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اسلام یہ ہے کہ تم اس بات کو (حقیقت کو سچے دل سے / شہادت دو) مان جاؤ کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔ نماز قائم کرو، نماز کے اوقات میں، خود پڑھو اور اپنے ماتحتوں کو اس کی تلقین بھی کرو، زکوٰۃ دو، اگر صاحب نصاب ہو اور مال پر سال گزر گیا ہو، رمضان المبارک کے روزے رکھو، اگر کوئی شرعی عذر در پیش ہو تو قضا کر لو، سامانِ سفر مہیا ہوں تو حج ادا کرو۔ اُس شخص نے یہ سب سنا اور کہا: آپ نے سچ فرمایا!

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہمیں اس کے اس عمل پر تعجب ہوا کہ پہلے ایک اجنبی شاگرد کی طرح آکر سوال کرتا ہے اور پھر خود ہی ایک باوقار استاد کی طرح (جیسے کہ وہ پہلے سے ان سب باتوں کو جانتا ہو) سن کر تصدیق کرتا ہے۔

اس کے بعد پھر وہ دوسرا سوال کرتا ہے: جناب مجھے ایمان کی حقیقت سے آگاہ کیجیے! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جواب میں ارشاد فرماتے ہیں: ایمان یہ ہے کہ تم اللہ، اس کے فرشتوں، اس کی نازل کی گئی کتابوں اور اس کے بھیجے ہوئے تمام رسولوں پر ایمان لاؤ اور یہ بھی ضروری ہے کہ تم اچھی بری تقدیر پر یقین رکھو۔ یہ سن کر پھر اس نے تصدیق کی کہ آپ نے سچ فرمایا اور پھر تیسرا سوال بھی کر لیا کہ اب مجھے یہ بتائیے کہ احسان کیا چیز ہے؟ اللہ کے محبوب پیغمبر حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طرح کرو جیسے کہ وہ تمھارے سامنے ہو اور تم اُسے دیکھ رہے ہو، اگر یہ نہ ہو سکے، کیوں کہ تم اللہ تعالیٰ کو نہیں دیکھ سکتے، اس لیے تم اپنے آپ کو اتنا دھیان میں لگاؤ (اس یقین کے ساتھ عبادت کرو) کہ اللہ تمھیں دیکھ رہا ہے۔ پھر اس نے اس کے بعد ہی ایک اور سوال کیا کہ یا رسول اللہ مجھے قیامت کے بارے بتلائیے کہ وہ کب آئے گی۔ اس بات کا جواب دیتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اس کے بارے میں، میں بھی اتنا ہی جانتا ہوں جتنا کہ تم جانتے ہو، میرا علم تم سے زیادہ نہیں ہے۔ اُس شخص نے کہا کہ اچھا پھر کچھ نشانیاں ہی بتلا دیجیے؟ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: قیامت کی نشانیوں میں سے کچھ نشانیاں یہ ہیں کہ غلام عورت (لونڈی / باندی) اپنے مالکہ کو جنے گی، ننگے پیر اور ننگے بدن، مفلس، فقیر اور چرواہوں کو تم عالیشان عمارتوں، بڑے بڑے / اونچے اونچے محلوں پر اتراتے دیکھو گے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ اس کے بعد وہ آدمی چلا گیا، میں کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اِس کے تعلق سے دریافت کرنے والا تھا کہ خود پیارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھ سے ہی معلوم کر لیا کہ عمر! سوال یہ سوال کرنے والے آدمی کو جانتے ہو؟ میں نے کہا اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم زیادہ بہتر جانتے ہیں۔ ''یہ حضرت جبرئیل علیہ السلام تھے جو اس طرح تم لوگوں کو تمھارا دین سکھانے آئے تھے''۔

(م۔ط۔ب)

گوشۂ ادب

شاعری کی حقیقت

علامہ شبلی نعمانیؒ

شاعری چونکہ وجدانی چیز ہے اس لیے اس کی جامع ومانع تعریف چند الفاظ میں نہیں کی جاسکتی، اس بنا پر مختلف طریقوں سے اس کی حقیقت کا سمجھانا زیادہ مفید ہوگا کہ ان سب کے مجموعہ سے شاعری کا ایک صحیح نقشہ پیش نظر ہوجائے۔

خدا نے انسان کو مختلف اعضا اور مختلف قوتیں دی ہیں، اور ان میں سے ہر ایک کے فرائض اور تعلقات الگ ہیں، ان میں دو قوتیں، تمام افعال اور ارادات کا سرچشمہ ہیں، ادراک اور احساس، ادراک کا کام، اشیا کا معلوم کرنا اور استدلال اور استنباط سے کام لینا ہے۔ ہر قسم کی ایجادات تحقیقات، انکشافات اور تمام علوم وفنون کے نتائج عمل ہیں۔

احساس کا کام کسی چیز کا ادراک کرنا، یا کسی مسئلہ کا حل کرنا، یا کسی بات پر غور کرنا اور سوچنا نہیں ہے، اس کا کام صرف یہ ہے کہ جب کوئی مؤثر واقعہ پیش آتا ہے تو وہ متاثر ہوجاتا ہے، غم کی حالت میں صدمہ ہوتا ہے، خوشی میں سرور ہوتا ہے، حیرت انگیز بات پر تعجب ہوتا ہے، یہی قوت جس کو احساس، انفعال، یا فیلنگ سے تعبیر کرسکتے ہیں، شاعری کا دوسرا نام ہے، یعنی یہی احساس جب الفاظ کا جامہ پہن لیتا ہے، تو شعر بن جاتا ہے۔

حیوانات پر جب کوئی جذبہ طاری ہوتا ہے تو مختلف قسم کی آوازوں یا حرکتوں کے ذریعہ سے ظاہر ہوتا ہے۔ مثلاً شیر گونجتا ہے، مور چنگھاڑتے ہیں، کوئل کوکتی ہے، طاؤس ناچتا ہے، سانپ لہراتے ہیں۔ انسان کے جذبات بھی حرکات کے ذریعہ سے ادا ہوتے ہیں لیکن اس کو جانوروں سے بڑھ کر ایک اور قوت دی گئی ہے۔ یعنی نطق اور گویائی۔ اس لئے جب اس پر کوئی قوی جذبہ طاری ہوتا ہے تو بے ساختہ اس کی زبان سے موزوں الفاظ نکلتے ہیں۔ اسی کا نام شعر ہے۔

اب منطقی پیرایہ میں شعر کی تعریف کرنا چاہیں تو یوں کہہ سکتے ہیں کہ جو جذبات، الفاظ کے ذریعہ سے ادا ہوں وہ شعر ہیں۔ اور چونکہ یہ الفاظ، سامعین کے جذبات پر بھی اثر کرتے ہیں، یعنی سننے والوں پر بھی وہی اثر طاری ہوتا ہے، جو صاحب جذبہ کے دل پر طاری ہوا ہے۔ اس لئے شعر کی تعریف یوں بھی کرسکتے ہیں کہ جو کلام انسانی جذبات کو برانگیختہ کرے، اور ان کو تحریک میں لائے، وہ شعر ہے۔

ایک یوروپین مصنف لکھتا ہے کہ ’’ہر چیز جو دل پر استعجاب، یا حیرت یا جوش یا اور کسی قسم کا اثر پیدا کرتی ہے شعر ہے، اس بنا پر فلک نیلگوں، نجم درفشاں، نسیم سحر، گلگونہ شفق، تبسم گل، خرام صبا، نالۂ بلبل، ویرانی دشت، شادابی چمن، غرض تمام عالم شعر ہے۔ یہ آج کل کا خیال ہے۔ لیکن عجیب بات ہے کہ حضرت خواجہ فریدالدین عطار نے آج سے چھ سو برس پہلے کہا تھا۔

پس جہان شاعر بود چوں دیگراں

جو چیزیں دل پر اثر کرتی ہیں، بہت سی ہیں۔ مثلاً موسیقی، مصوری، صنعت گری وغیرہ لیکن شاعری کی اثر انگیزی کی حد سب سے زیادہ وسیع ہے۔ موسیقی صرف قوت سامعہ کو محظوظ کرسکتی ہے۔ سامعہ نہ ہو تو وہ کچھ کام نہیں کرسکتی تصویر سے متاثر ہونے کے لئے بینائی شرط ہے، لیکن شاعری تمام حواس پر اثر ڈال سکتی ہے، باصرہ، ذائقہ، شامہ، لامسہ، سب اس سے لطف اٹھاسکتے ہیں۔ فرض کرو، شراب آنکھوں کے سامنے نہیں ہے اس لئے آنکھ اس وقت اس سے حظ نہیں اٹھاسکتی لیکن جب ایک شاعر اس کو آتش سیال سے تعبیر کرتا ہے تو ان الفاظ سے ایک مؤثر منظر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے، اسی طرح جب بوسہ کو شاعرانہ انداز میں تنگ شکر کہہ دیتے ہیں تو کام وزبان کو مزہ محسوس ہوتا ہے۔

کسی 1 چیز کی حقیقت اور ماہیت کے تعین کرنے کا آسان علمی طریقہ یہ ہے کہ پہلے اس کا کوئی نمایاں وصف لے لیا جائے پھر یہ دیکھا جائے کہ اس وصف میں اور کیا کیا چیزیں اس کے ساتھ شریک ہیں۔ پھر ان صفات کو ایک ایک کرکے متعین کیا جائے جن کی وجہ سے یہ چیز اپنی اور ہم جنس چیزوں سے الگ اور ممتاز ہوتی گئی ہے۔

اس قدر سب تسلیم کرتے ہیں کہ شعر کا نمایاں وصف جذبات انسانی کا برانگیختہ کرنا ہے یعنی اس کو سن کر دل میں رنج، یا خوشی، یا جوش کا اثر پیدا ہوتا ہے۔ یہ خصوصیت، شاعری کو سائنس اور علوم وفنون سے ممتاز کردیتی ہے، شاعری کا تخاطب جذبات سے ہے اور سائنس کا یقین سے، سائنس، استدلال سے کام لیتا ہے اور شاعری محرکات کو استعمال کرتی ہے، سائنس عقل کے سامنے کوئی علمی مسئلہ پیش کرتا ہے لیکن شاعری احساسات کو دلکش مناظر دکھاتی ہے لیکن یہ خاصیت، موسیقی، تصویر بلکہ مناظر قدرت میں پائی جاتی ہے، اس لئے کلام یا الفاظ کی قید لگانی چاہئے کہ یہ چیزیں بھی اس دائرہ سے نکل جائیں۔

تاہم خطبہ (لکچر) تاریخ، افسانہ اور ڈرامہ، شاعری کی حد میں داخل رہیں گی ان میں اور شعر میں حد فاصل قائم کرنا مشکل ہے، زیادہ دقت اس لئے ہوتی ہے کہ اکثر اعلیٰ نظمیں افسانہ کی شکل میں ہوتی ہیں، اور اکثر افسانوں میں شاعری کی روح پائی جاتی ہے، اس لئے دونوں جب باہم مل جاتی ہیں، تو ان میں امتیاز کرنا مشکل ہوجاتا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ افسانہ اسی حد تک افسانہ ہے، جہاں تک اس میں خارجی واقعات اور زندگی کی تصویر ہوتی ہے۔ جہاں سے اندرونی جذبات اور احساسات شروع ہوتے ہیں، وہاں شاعری کی حد آجاتی ہے۔ افسانہ نگار، بیرونی اشیاء کا استقصا کے ساتھ مطالعہ کرتا ہے، بخلاف اس کے شاعر، اندرونی جذبات اور احساس کی نیرنگیوں کا ماہر بلکہ تجربہ کار ہوتا ہے۔

☆☆☆

R.N.I. No. UPURD/2009/32310
Postal Regd. No. ALG/104/ 2023-25

ISSN 2456-7175
Vol. XV, Issue XII (June- 2024)

NIDA-E-AETIDAL MONTHLY

Madrasatul Uloom-Al-Islamia, Hamdard Nagar-D, Jamalpur, Aligarh (U.P.)
Under the management of:
Allama Abul Hasan Ali Nadwi Educational & Welfare Foundation, Aligarh

www.nadwifoundationaligarh.org
Printed & Published by Saeed Ahmad Ansari Nadwi behalf of the office of Allama Abul Hasan Ali Nadwi Educational & Welfare Foundation
Hamdard Nagar-D, Jamalpur, Aligarh at *Ideal Graphics Enterprises*, Patwari Nagla, Aligarh
Editor : Dr. M. Tariq Ayubi Nadwi